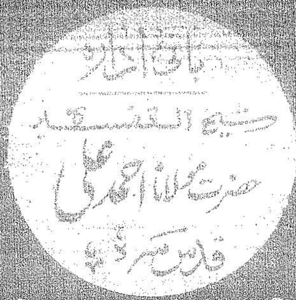
ہفت روزہ
لاہور پاکستان

خدام الدین

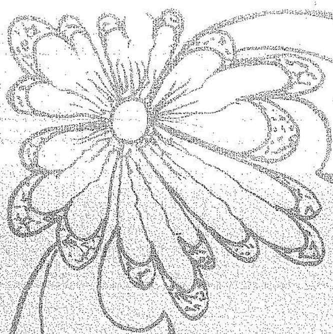


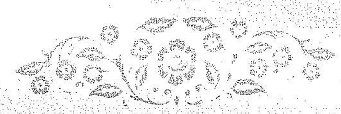






مطبوعات انجمن خدام الدین لاہور پاکستان





دینِ نبیؐ کے باغ کی بہار تھے حسینؓ
خلدِ بریں کے حق سے طلبگار تھے حسینؓ

اپنوں کے حق میں گلشنِ بے خار تھے حسینؓ
غیروں کے حق میں تیغ تھے تلوار تھے حسینؓ

اصحابِ مصطفیٰؐ کے لیے بوئے گل حسینؓ
نورِ نگاہِ سیدِ ابرار تھے حسینؓ

آغوشِ مرتضیٰ میں ہوئی جس کی پرورش
"عالی مقام" صاحبِ کردار تھے حسینؓ

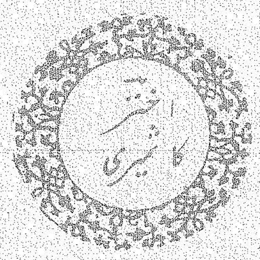
جانِ جہاں پہ جان کو قربان کر دیا
خیبر شکن کے لاڈلے "جی دار" تھے حسینؓ

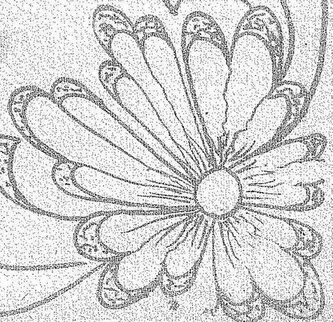
نیزے پہ سر کو دیکھ کے بولے زیاد و شمر
میدانِ کارزار کی یلغار تھے حسینؓ

گرنے دیا نہ آپؓ نے اسلام کا علم
مٹنے دیا نہ دین، کہ خوددار تھے حسینؓ

آنے دیا نہ حرف پیمبرؐ کی آن پر
اہلِ وفا کے قافلہ سالار تھے حسینؓ

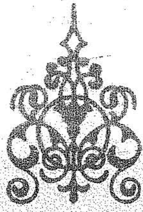
خنجر بکف تنہا عرصۂ جنگاہ میں جنوں
جور و ستم سے برسرِ پیکار تھے حسینؓ











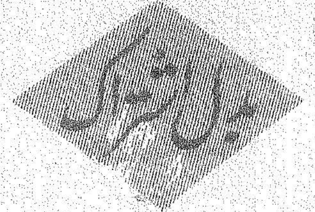
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



۱۱ر محرم الحرام ۱۳۹۵ھ
۲۴ر جنوری ۱۹۷۵ء

جلد ۲۰

شمارہ ۳۵



سالانہ ۲۶/- روپے
ششماہی ۱۴/- روپے
سہ ماہی ۷/- روپے
فی شمارہ ۶۰ پیسے

چیف ایڈیٹر
جانشین شیخ التفسیر
مولانا عبید اللہ انور

ایمان ما اطاعتِ آلِ محمدؐ است

عیسوی شب و روز اور ہجری لیل و نہار میں فرق یہ ہے کہ پہلا سن یہود و نصاریٰ کی یادگار اور دوسرا سن اسلامی شعائر و اقدار کا آئینہ دار ہے — اسلامی سال کی محرّم الحرام سے ابتداء اور ذوالحجہ پر انتہا ہوتی ہے۔ سال کا آغاز صبرِ حسینؓ اور انجام رضائے اسماعیلؑ ہے۔ ابتداء از انتہا ایثار و قربانی اور قربانی و ایثار کے جلوے اور مناظر نظر آتے ہیں — سال کی ابتداء ہو چکی ہے اور جب یہ شمارہ قارئین کے ہاتھوں تک پہنچے گا، محرم الحرام کا عشرہ اولیٰ قریب الاختتام ہوگا اور عقیدت مندانِ حسینؓ رنج و ملال اور یاس و الم کی تصویر بنے ہوں گے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ نبیرۂ رحمتِ مجسّم سیدنا حسینؓ کی شہادت ظلم و ستم اور جبر و استبداد کی بے دردیوں اور سفاکیوں کا ایک دلخراش واقعہ ہے۔ انسانی سرفرازی و سربلندی کی ایک لازوال داستان ہے۔ شرفِ انسانیت اور شہیدانِ راہ وفا کی ناقابلِ فراموش کہانی ہے۔ انسان کے پستی سے بلندی کی طرف ارتقاء کی روداد اور عشق و مستی کی کیفیات کا حاصل ہے۔ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی قدروں کی تفسیر اور اخلاقی حدود و قیود کے فلسفوں کی تعبیر ہے۔ مقامِ غلامی سے منزلِ حریت و آزادی کے سفر کی ایک راہ ہے — دنیا میں الٰہی حکومت کے قیام اور کفر و باطل کے صنمکدوں کے انہدام کا اعلان ہے — صبرِ جمیل اور اجرِ جزیل کا ابلاغ اور انسانی فکر و نظر کی تکمیل کی راہ کا چراغ ہے — اس چراغ کو جب کفر و باطل کی آندھیاں گُل کرنا چاہتی ہیں تو کربلا کے ذرّے پکار اٹھتے ہیں۔ ع

"پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا"

جب راہِ حق کے مسافروں کے قدم ڈگمگاتے ہیں تو حسینؓ کا استقلال انہیں سہارا دیتا ہے، جب دولت و شوکت اور حشمت و جاہ کے متوالے، قوت و اقتدار کے پجاری، فرعونیت و نمرودیت کے بُتکدے

کے محافظ، انسانی عزتوں کے سوداگر اور روحانی عصمتوں کے تاجر، شرفاء کے دشمن اور دریوزہ گر، حق پرستوں کی تنگ دستی و تہی دستی اور زیردستوں کی فاقہ مستی کا "مزاح" اڑاتے ہیں تو ایسی حالت میں خاندانِ نبوت کی بے سروسامانی ان کو اپنی جانب متوجہ کر دیتی ہے۔ جب اقتدار و اختیار کے تختِ طاؤس پر متمکن افراد و اشخاص، بوریہ نشین اور بے گلیم وارثانِ منبر و محراب کی بے وسیلہ جماعتوں پر عرصۂ حیات تنگ کرتے ہیں تو اس وقت علی اکبرؓ اور علی اصغرؓ کی کسمپرسی کا عالم ان کے حوصلوں اور ولولوں کو تیز کر دیتا ہے۔ جب حق پرستوں کی جماعت پر باطل پرستوں کا پنجۂ استبداد لہراتا ہے تو نیزے کی انی پر حضرت حسینؓ کا مسکراتا ہوا چہرہ ان کے "ذوقِ جرم" کو کچھ اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ پس عاشقانِ حسینؓ کے لیے یہی سرمایۂ حیات ہے کہ وہ آہ و فغاں اور نالہ و بکا، سینہ کوبی و چاک دامانی کے بجائے ذکرِ حسینؓ اور فکرِ حسینؓ کی جستجو کریں ؎

موجوں کے ساتھ صاحبِ ہمت نکل گئے
ڈوبے وہی کہ جن کے ارادے بدل گئے

ماہِ جنوری اور مرزا ناصر

نیشنل اسمبلی پاکستان کے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے "تاریخ ساز فیصلہ" کے بعد قادیانی ذریت کے سیاسی "جوتشی" مرزا ناصر نے اعلان کیا تھا کہ میں اس فیصلہ پر جنوری میں تبصرہ کروں گا۔ اس سال ماہِ محرم اور ماہِ جنوری دونوں ایک ساتھ آئے ہیں۔ ہماری اپنی تو رائے یہ ہے کہ مرزا ناصر صاحب نے بڑی سوچ و بچار کے بعد یہ اعلان کیا ہے۔ بلکہ ۷۵ء کے کیلنڈر پر انگلی رکھ کر "مطلع" دیا ہے۔ اس لیے ہمیں اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ قادیانی "تیس مار خاں" اپنے "علی بابا" کے اشارے پر ایک اور ٹیسٹ کیس بنانے کے لیے شیعہ ماتمداروں اور سنی راہگیروں یا تماش بینوں میں گلی ڈنڈا کھیلنے کی طرح ڈالیں گے جس کے نتائج و محرکات ملک و ملت کے حق میں یقیناً خطرناک ہوں گے اس کے بعد مرزا ناصر صاحب کے لیے "تبصرہ" فرمانا یا "مقطع" کہنا بہت آسان ہو گا۔ اس موقع پر مسلمانوں کو بیحد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

حکومتِ برطانیہ کی شرمناک جسارت

برطانوی سامراج کی اسلام دشمنی "ضرب المثل" ہے۔ حال ہی میں حکومتِ برطانیہ نے حسبِ عادت اپنے ٹیلیویژن پر ہادیٔ کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توہین آمیز مناظر پیش کر کے مسلمانانِ عالم کی غیرت کو چیلنج کیا ہے۔
ہم یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ ہمارے ذرائع معلومات محدود ہیں
یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ حکومت پاکستان نے حکومتِ برطانیہ سے اس سلسلے میں کوئی احتجاج کیا ہے۔ اسی طرح ہمیں اس بات کے متعلق بھی اشتباہ ہے۔ کہ ہمارے سفارتخانے نے کوئی کردار ادا کیا ہے اگر حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی ہوئی ہے تو ہمارے سامنے نہیں آئی مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے بارے میں سب سے زیادہ حساس ہیں اور اس قسم کے واقعات سے ان کے جذبات کے بھڑکنے کے امکانات واضح ہیں۔ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ اپنی پوزیشن صاف کرے اور حکومتِ برطانیہ کو تادیبی اور احتجاجی مراسلات بھیج کر معافی مانگنے پر مجبور کرے اور اگر برطانیہ معافی مانگنے میں پس و پیش کرے تو اس سے سفارتی تعلقات ختم کر دیے جائیں۔

تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

لنکن کا قول ہے کہ: "مجھے وہ شخص بہت یاد آتا ہے جس نے اپنے ماں باپ کو قتل کر دیا تھا جب اُسے سزا سنائی گئی تو اس نے یہ کہہ کر رحم کی درخواست کی کہ "میں یتیم ہوں"۔ ہمارے بعض وزراء صاحبان کی حالت بھی اس "قاتل یتیم" جیسی ہے۔ وہ اپنے مخالفین کے خلاف بڑے تسلسل سے دشنام طرازی فرماتے ہیں لیکن جب کوئی شخص ان کو روکتا یا ٹوکتا ہے

(باقی صفحہ ۱۰ پر)



فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مرادِ رسولؐ تھے

جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور دامت برکاتہم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ
امّا بعد:

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم:
بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم:
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْھُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ۝

محمدؐ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں زور آور ہیں کافروں پر، نرم دل ہیں آپس میں، دیکھئے ان کو رکوع اور سجدے میں، ڈھونڈتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشی، نشانی ان کی ان کے منہ پہ ہے سجدے کے اثر سے۔ یہ شان ہے ان کی توراۃ میں اور مثال ان کی انجیل میں، جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پٹھا پھر اس کی کمر مضبوط کی پھر موٹا ہوا، پھر کھڑا ہو گیا اپنی نال پر، خوش لگتا ہے کھیتی والوں کو، تاکہ جلائے ان سے جی کافروں کا۔ وعدہ کیا ہے ان سے اللہ نے جو یقین لائے ہیں اور جنہوں نے اچھے کام کئے ہیں، معافی کا اور بڑے ثواب کا۔

یعنی کافروں کے مقابلہ میں سخت، مضبوط اور قوی جس سے کافروں پر رعب پڑتا ہے اور کفر سے نفرت و بیزاری کا اظہار ہوتا ہے۔

بزرگان محترم و معزز خواتین! گذشتہ سے پیوستہ جمعہ اور اس سے پہلے خطبات کا موضوع حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور سیرت اور سوانح تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ ۱۸ ذوالحجہ کو شہید ہوئے اور ذوالحجہ کے مہینے میں یہی موضوع چلتا رہا۔

۲۷ ذوالحجہ حضرت عمر فاروقؓ کا یوم شہادت ہے۔ گذشتہ جمعہ کا موضوع یہی تھا لیکن مطالبات کانفرنس کی وجہ سے اس پر روشنی نہیں ڈالی جا سکی۔ اس لیے آج کے خطبہ کا عنوان سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جن کو ۲۴ ذوالحجہ کو ایک منافق مغیرہ بن شعبہ کے ایرانی غلام ابو لولو نے نماز فجر پڑھاتے ہوئے خنجر کی ایک کاری ضرب لگائی ۲۷ ذوالحجہ ۲۳ھ بدھ کی رات کو آپ نے شہادت پائی۔

حضرت عمر فاروقؓ مراد رسولؐ تھے، ان کو اللہ سے دین کی اشاعت کے لیے اللہ کے رسولؐ نے خود مانگا تھا اور جب وہ اسلام میں آئے تو انہوں نے کفر و اسلام میں حدِ فاصل کھینچ دی مسلمان اعلانیہ

نمازیں پڑھنے اور دوسرے ارکان اسلام ادا کرنے لگے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دور میں بھی کے وزیر اور مشیر رہے۔ حضورؐ کے وصال کے موقع پر جب مسئلہ خلافت پر مہاجرین اور انصار میں اختلاف پیدا ہوا تو یہ اختلاف آپ نے کمال تدبر سے دور کیا اور سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ آپ نے ملتِ اسلامیہ کو خلافت صدیقی پر جمع فرمایا اور الائمۃ من قریش والی حدیث لوگوں کی سمجھ میں آئی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی اولاد شروع ہی سے خانہ کعبہ کی تولیت ارکان حج اور دوسرے مناسک کی ادائیگی کرانے اور تمام امور میں پیش پیش تھی۔ اس وقت مسلمانوں کو یہ نکتہ سمجھ آگیا کہ مہاجرین میں سے مسلمانوں کا خلیفہ اور انصار میں سے خلیفہ کے وزراء و مشیر ہونے چاہئیں چنانچہ سب مسلمان اس پر متفق ہو گئے۔ آپ جس ہستی کے خلیفہ تھے وہ افضل البشر بعد الانبیاء مانی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ ہستی دعائے خلیل حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نائب اور قائم مقام تھی۔ حضرت خلیل اللہ کی یہ دعا قرآن میں موجود ہے:

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

"اور یاد کر جب ابراہیمؑ اٹھاتے تھے بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیلؑ اور دعا کرتے تھے اے پروردگار ہمارے قبول کر بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔"

رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پہلے جانشین حضرت صدیقؓ تھے ان کی جانشینی پر امت کے جمع کرنے والے فاروق اعظمؓ ہی تھے۔ اور حضرت صدیقؓ کے دور خلافت میں اکثر امور سرانجام دینے والے بھی فاروق اعظمؓ ہی تھے۔ جب ان کا اپنا دور آیا تو تمام کائنات نے دیکھ لیا کہ انہوں نے اسلام کو کس طرح سربلند کیا۔ فاروق اعظمؓ اسلام کے درخشندہ اور روشن ستارے تھے اور ان کا عادلانہ دورِ حکومت آفتاب نصف النہار کی طرح روشن رہا۔ ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ بنے تو یہ بھی شوریٰ کے فیصلے سے منتخب کیے گئے ان کی شہادت کے ساتھ ہی مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ جو تلوار اس وقت میان سے نکلی دوبارہ میان میں داخل نہ ہو سکی۔ اور حضرت علیؓ کی خلافت پر اسی وجہ سے اتفاق نہ رہا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ خلافت کا یہ انعقاد بھی اللہ کی مرضی سے ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی موجودگی میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امام بنایا، ان کے پیچھے نماز پڑھی، سفر و حضر اور غار کا ساتھی بنایا۔ لوگوں نے ان کو خلیفہ بنا لیا۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔ جو لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں، غاصب کہتے ہیں ان کو یہ ماننا پڑے گا کہ اگر خلفاء ثلاثہ غاصب تھے تو تو دین سارے کا سارا مشکوک ہے کیونکہ یہ دین ان ہی کے طفیل ہم تک پہنچا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم اور علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔

ان احادیث کو نظر انداز کر کے کون سے دین کی اور کس کے دین کی پیروی کی جا سکتی ہے؟

صحابہ کرامؓ نے جو دین ہم تک پہنچایا وہ ہی اصل دین ہے اور ہم اس پر چلنے کی نماز میں سورہ فاتحہ پڑھتے ہوئے دعا مانگتے ہیں یہی انبیاء، شہداء اور صالحین کی راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان ہستیوں کے نقش قدم پر چلائے۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

خدام الدین کے آئندہ شمارے میں!

۱۰ر جنوری ۲۶ ذوالحجہ کو مطالبات کانفرنس میں کی ہوئی مولانا عبیداللہ انور مدظلہ کی ایک تاریخی اور یادگار تقریر شائع ہو رہی ہے۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

تبرکاتِ
مجلسِ ذِکر



★

مومن

"یادِ الٰہی" سے کبھی غافل نہیں ہوتا!

جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور دامت برکاتہم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ؞
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؞

ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃً ضنکا ونحشرہ یوم القیٰمۃ اعمٰی ۝ (سورہ طٰہٰ آیت ۱۲۴)

رب العالمین نے انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ عبدیت اور بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن جائے اور ان نعمتوں کی قدر کرے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمائی ہیں۔ خدائے ارحم الراحمین کے ان گنت احسانات میں سے ایک احسان عظیم الشان نعمت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے احسانات اور دی ہوئی نعمتوں کا شکر کرنے اور اسے یاد کرنے والوں کو مزید احسانات اور رحمتوں سے مالا مال کر دیتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ یعنی افضل ترین ذکر کلمہ طیبہ ہے۔ ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ ہم یادِ الٰہی میں مشغول رہا کریں۔ رب العالمین کے بلند و ذی شان پاک نام کا ذکر ہر وقت دل کی دھڑکنوں کے ساتھ جاری رہے تاکہ جب جان عزیز جان آفریں کے سپرد کرنے کا وقت آئے تو دل صرف اللہ کی یاد سے معمور ہو اور زبان بھی اسی کی بزرگی اور جمال جہاں آرا کی حمد و توصیف میں زمزمہ سرا ہو۔ جس شخص پر حالت ایمان میں موت آئی وہ کامیاب ہو گیا اور جسے مرتے وقت ایمان نصیب نہ ہوا وہ ناکام و نامراد رہا۔ خواہ اس سے پہلے اس نے زندگی کتنی عبادتوں اور ریاضتوں میں کیوں نہ گزاری ہو کیونکہ خدا فراموشی اور دنیاوی اغراض و خواہشات میں انہماک اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کی ناشکری اور ناقدری کے مترادف ہے جو ایک وفادار اور فرمانبردار مومن نہیں کر سکتا۔ مومن سے جب بھی لغزش اور گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو شرمندگی اور ندامت سے اس کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ اس کا دل اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے خوف سے کانپ اٹھتا ہے پھر وہ معافی اور توبہ کے لیے رو رو کر دعائیں کرتا اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے گویا اس پر فکر و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں اس کے برعکس نافرمان، غافل اور خواہشات کے پرستار ڈھٹائی سے گناہ کرتے ہیں۔ اہل حق کا مذاق اڑاتے اور دنیا کے اس نشے میں مست رہتے ہیں جو کسی وقت بھی ہرن ہو سکتا ہے ممکن ہے ان کے ہاتھ سے یہ تمام وسائل تعیش اور ذرائع آرام و راحت بیک جنبش چھن جائیں۔ دولت پر ڈاکہ پڑ جائے، فلک بوس محل و ایوان و حرام سے گر پڑے، کوئی حادثہ پیش آ جائے یا موت کا زبردست ہاتھ جھپٹ کر ان سے ان کا وجود تک چھین لے اور ان کے سارے پروگرام اور منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی دنیا میں بھیجا تھا اور انہیں زندگی کی ضروریات فراہم کیں، سوچنے اور غور کرنے کے لیے دل و دماغ دیا۔ دین کا صحیح راستہ بتانے کے لیے اپنے نیک بندوں کو بھیجا۔ اس کا فریضہ تھا کہ وہ ان نیک لوگوں اور دین سکھانے والوں سے رہنمائی حاصل کرتا اور جہالت و گمراہی کے بجائے علم و معرفت دین اور اتباع احکام خداوندی کی زندگی اختیار کرتا لیکن اس نے اللہ کی نعمتوں کی قدر نہ کی، صلاحیتوں کو اوباش اور معصیت کے کاموں میں صرف کر کے اپنے رب کی ناراضگی سے دامن بھر لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہم ایسے شخص کو قیامت

کے روز اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ دنیا میں بھی اسے مال و دولت ہونے کے باوجود چین نصیب نہیں ہوگا۔ زندگی اضطراب، پریشانی بے اطمینانی میں ہی گزرے گی۔ قیامت کے روز کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا۔ حالانکہ دنیا میں بینا تھا، میرے پاس آنکھیں تھیں۔ جواب ملے گا کہ دنیا میں ایسا ہی ہوا تھا کہ تیرے پاس ہماری نشانیاں اور آیات پہنچی تھیں۔ فہم و بصیرت ہونے کے باوجود تو نے انہیں بھلا دیا یعنی ان سے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ انہیں دیکھ کر بھی اللہ کو یاد نہ کیا اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:۔ کذالک الیوم تنسی اسی طرح آج تو بھی بھلا دیا گیا۔

یعنی رحمت خداوندی اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوگی اور عذاب جہنم میں گرفتار رہے گا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

یعنی آنکھوں سے اندھا کر کے محشر کی طرف لایا جائے گا۔ اور دل کا بھی اندھا ہوگا کہ کسی حجت کی طرف رستہ نہ پائے گا یہ ابتدائے حشر کا ذکر ہے پھر آنکھیں کھول دی جائیں گی۔ تاکہ دوزخ وغیرہ احوال محشر کا معائنہ کرے جو کافر دنیا میں ظاہری آنکھیں رکھتا تھا تعجب سے سوال کرے گا کہ آخر مجھ سے کیا قصور ہوا جو آنکھیں چھین لی گئیں۔ (جواب میں فرمایا جائے گا کہ) دنیا میں ہماری آیات دیکھ سن کر یقین نہ لایا۔ نہ ان پر عمل کیا۔ ایسا بھولا رہا کہ سنی ان سنی کر دی۔ آج اسی طرح تجھ کو بھلایا جا رہا ہے۔ جیسا وہاں اندھا بنا رہا تھا یہاں اسی کے مناسب سزا ملنے اور اندھا کر کے اٹھائے جانے پر تعجب کیوں ہے؟"

یہ ہے کافر کی زندگی اور اس کا انجام جو سراسر ناکامی و نامرادی ہے جس خوشی کے بعد رنج و افسوس کا آنا لازمی قرار پایا ہو اسے خوشی نہیں کہا جا سکتا اور اس پر خوش ہونا حماقت ہے اور جس کامیابی اور عزت و وقار کے بعد ناکامی و خسران اور ذلت و رسوائی کے عذاب کی خبر سنائی گئی ہو، اس کے نشے میں غرق ہو جانا اور اترانے پھرنا صریح بے وقوفی اور کھلا پاگل پن ہے ایسے لوگوں کی عقل اور نصیب پر جتنے آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔

قرآن کریم نے منکرین صداقت کی جس غفلت شعاری اور خدا فراموشی کا تذکرہ کر کے آخرت کے عذاب الیم سے انہیں خبردار کیا ہے۔ مسلمان کہلانے والوں کو بھی اپنے کردار و عمل کا جائزہ لینا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ غفلت اور اعراض عن الحق کا مہلک مرض ان کی زندگیوں میں بھی سرایت نہ کر گیا ہو اور ان کی موجودہ تنگیوں، ناکامیوں، ذلتوں، رسوائیوں، بربادیوں اور باہمی سر پھٹول و انتشار کا باعث یہی ہو کہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کا کلمہ پڑھنے کے باوجود ان ناپسندیدہ اعمال کے مرتکب ہو رہے ہوں جن کا کرنا الٰہ العٰلمین کے غصہ اور ناراضگی کو دعوت دیتا ہو اور ان کے کرنے والوں کے متعلق خواہ وہ کتنے ہی صاحب مرتبہ کیوں نہ ہوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فلیس منا کا اعلان فرما دیا ہو کہ ان کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

بلاشبہ آج ملت اسلامیہ کی اجتماعی رسوائی، دشمنوں کے مقابلہ میں شکست اور سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بے چینی اور بے اطمینانی کی اصل وجہ اللہ کی یاد سے غفلت، اللہ سے نہ مانگنا، مادی وسائل پر بھروسہ کر لینا اور احکام خداوندی کو نظر انداز کر دینا ہے۔ جب پریشانی اور بربادی کا راستہ ہم نے خود اختیار کر لیا ہو تو کامیابی اور اعتماد و اطمینان کی نعمت ہمیں کیسے میسر آسکتی ہے۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، منکرات سے اجتناب کرتے، نیکی پر عمل کرتے اور سچائی کا پرچار کرتے ہیں

بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلوا علیہ وآلہ

مولانا مناظر احسن گیلانی رح

شہادت حسنیٰ

ننھے بچے کی تربیت و پرورش کے لئے محسوس قوتوں میں سب سے بڑی قوت وہ ہے جسے باپ کہتے ہیں لیکن کیا تماشا ہے کہ وہ بزور توڑ دیا گیا اور پیدا ہونے سے پیشتر ہی توڑ دیا گیا، وہ آیا اور اس شان کے ساتھ آیا، کہ جس کو لوگ پالنے والا کہتے ہیں وہ مدینہ کے ایک میدان میں سویا ہوا تھا سعد کے کنبے والو دوڑو اور اس بچہ کو چھاتی سے لگاؤ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔

جن کے پاس سب کچھ تھا انہیں دھکیل دیا گیا، جس کی اونٹنی کا تھن خشک ہو چکا تھا اور خود جس کے پاس دودھ کا ایک قطرہ نہ تھا، کچھ نہ تھا، اسی نے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ جب واپس کرنے آئی تو تماشا یہ کیسا دردناک حصہ تھا کہ ایواء کے ایک جھونپڑے میں اس بچہ کی تربیت و پرداخت کرنے والی دوسری قوت بھی ہمیشہ کے لئے گم ہو گئی۔

پیر مرد، بوڑھا دادا اٹھتا ہے، اور اس کے سر پہ ہاتھ رکھتا ہے لیکن قدرت جس کے ساتھ کچھ نہیں رکھنا چاہتی وہ اٹھتی ہے اور اس ہاتھ کو بھی جھٹک کر علیحدہ کر دیتی ہے۔ اب کوئی نہیں، اس بچہ کا کوئی نہیں، اس کے پاس نہیں، ہاں! بہت سے چچا ہیں لیکن جن کے پاس بہت کچھ تھا، انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ان میں جو سب سے زیادہ نادار تھا اسی کے بچوں میں وہ بھی آ کر مل گیا، چچا نے نہیں، بلکہ بھتیجے نے بکریاں چرا کر اس کو کچھ دیا، اور اسی میں سے کچھ خود بھی کھا لیا۔

الغرض ایک بچہ پیدا ہوتا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کے ساتھ نہ باپ کی قوت ہے نہ ماں کی قوت، نہ اقربا اور اعزہ کی قوت ہے، کوئی قوت نہیں ہے، حتیٰ کہ وہ جس ملک میں پیدا ہوتا ہے، وہ بھی ہر قسم کی نباتی اور جماداتی قوتوں سے خالی ہے۔ میدان ہے، اور چٹیل میدان ہے۔ اس کا نام بن کھیتی کا بیابان ہے نہ اس کے آغوش میں ندیاں کھیلتی ہیں اور نہ دریاؤں کا شیریں پانی اس کو سیراب کرتا ہے نہ سرسبز مرغزار ہیں، نہ نظر فریب گلزار ہیں، الغرض انسانی دل و دماغ کے سنوارنے اور ابھارنے میں جن قدرتی ذرائع کو دخل ہے ان میں سے بھی اس میدان میں کچھ نہیں ہے، وہ جس شہر میں پیدا ہوتا ہے اس کے باشندوں کے پاس بھی کوئی قوت نہیں ہے نہ ذہنی قوت نہ سیاسی طاقت نہ علمی زور، یعنی جن قوتوں پہ قوموں کی تعمیر کھڑی ہوتی ہے وہ ہر ایک سے خالی ہیں۔ نہ وہ آئین رکھتے تھے نہ دستور نہ ان کا کوئی بادشاہ تھا نہ ان کی جماعتی پراگندیوں کا کوئی شیرازہ بند نہ ان کے پاس مکاتب تھے نہ مدارس، نہ کارخانے نہ فیکٹریاں، کچھ نہیں ان چیزوں میں سے ایک بھی نہیں جس میں داخل ہو کر کوئی بچہ پروان چڑھ سکتا ہو ان کے پاس جو جسمانی طاقت تھی اس کا مصرف بھی بجز اپنی تعداد گھٹانے کے اور کچھ نہ تھا۔

اسی ملک میں، اسی شہر میں، اسی قوم میں اس بچہ کا ظہور ہوا اور اس شان کے ساتھ ہوا کہ اس کے سر پہ جو قوت بھی سایہ فگن ہو سکتی تھی یا ہوتی تھی وہ ایک ایک کر کے مٹا دی جاتی تھی، یہاں تک کہ آخر میں یہ بھی ہوا کہ وطن پہ جو اسے بھروسہ ہو سکتا تھا اس بھروسہ کو بھی ہٹا دیا گیا۔ برادری والوں پہ جو اعتماد ممکن تھا وہ بھی ناممکن کر دیا گیا۔ یعنی سارا وطن اور وطن والے، قبیلے والے، کنبے والے، سب اس کی دشمنی پر متفق ہو کر آمادہ ہو گئے۔ اور وہ جس کے پاس نہ باپ کی قوت تھی اور نہ ماں کی نہ دادا کا زور تھا، نہ اور کسی کا نہ حکومت کی سرپرستی اسے حاصل تھی نہ مدرسوں کی تعلیم سے وہ فیض یاب ہو سکتا تھا، نہ اپنے ملک کے گرد و پیش کے خنک آمیز اثرات سے اپنے دماغ تک تازگی اور اس میں بالیدگی پیدا کر سکتا تھا، اب اس کے ساتھ یہ بھی کیا گیا کہ گھر والے کنبے والے، قبیلے والے، وطن والے سب کے سب اس سے علیحدہ ہو گئے یا وہ ان سے علیحدہ کر لیا گیا۔ اور اب جا کر یہ ارادہ پورا ہوا کہ دیکھو!

اس کے پاس کچھ نہیں

وہ ساری قوتیں جن کو لوگ قوت کہتے ہیں اور جن کا نام محسوس پرستوں کی اصلاح میں قوت ہے زور ہے۔۔ ایک ایک کر کے الگ کر لیا گیا، اس کے بعد دکھایا گیا۔ مشاہدہ کرایا گیا کہ

"جس کے پاس کچھ نہیں ہے، دیکھو! کہ اس کے پاس سب کچھ ہو گا۔

ایک منظر یہ تھا اور دوسرا منظر یہ ہے کہ وہ زمین کے ایک بالشت قطعہ کا مالک ہے۔ اس کے خادموں بلکہ خادموں سے نیچے اگر کوئی درجہ ہو سکتا ہے وہ ہی قیصر کی ٹوپی اچھال رہے ہیں، کسریٰ کے جلال و جبروت کے پرزے اڑا رہے ہیں۔ وہی جس کے پاس کچھ نہ تھا کیا دنیا نے نہیں دیکھا، یا نہیں دیکھ رہی ہے یا نہیں دیکھے گی کہ وہی دنیا میں سب سے بڑا قرار پایا۔ قومیں اس کی تقدیس میں مصروف ہیں، نسلیں اس کے سراہنے میں منہمک ہیں، افغانستان کی پہاڑیوں میں، مراکو کی وادیوں میں مصر کے ایوانوں میں، ہندوستان کی بستیوں میں، چین کی آبادیوں میں، افریقہ میں، ایشیا میں، یورپ میں، امریکہ میں، کون ہوا؟ اتنا بڑا کون ہوا؟ صرف ہمارے پاس نہیں، ہماری تاریخ میں نہیں، دوسروں کی تاریخ میں۔ کیا اس سے بھی اونچا انسان نسل اول میں کوئی ظاہر ہوا، مامون و ہارون کو کس کی غلامی پر ناز تھا۔ صلاح الدین کس کے نام پر صلیب والوں کی ہڈیوں میں لرزہ ڈالتا تھا؟ محمود کس کی جوتیوں کے صدقے میں مشرق کا اولو العزم فاتح قرار پایا۔ شاہجہاں کس کے نام کی تسبیح پڑھتا تھا؟ عالمگیر کس کی نگاہ کرم کے لئے دکن سنگستانوں میں سالہا سال تک ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا؟ کس کی ہمنامی کی برکت تھی کہ ایک ترک نے قسطنطنیہ کی دیواروں کو پھاند لیا؟ یہ کیا تھا؟ اس نے دعوے کیا تھا اور یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا کہ محسوس قوتوں کا انکار کرے اور جو قوت غیب میں چھپی ہوئی ہے نظام کائنات کو اسی کے ساتھ وابستہ کرے۔ اس نے دعوے کیا اور نہایت بلند آہنگی سے دعوے کیا اور خود اس کی دلیل بن کر دنیا کے سامنے آیا، کیونکہ قیاسی حجتوں کا زمانہ نکل چکا تھا۔ مشاہدات اور تجربات کا وقت آرہا تھا۔
پس اس عہد کے جو پیغمبر تھے صلی اللہ علیہ وسلم ان کا دعویٰ بھی تخمینی مقدمات سے نکالے ہوئے نتائج پر مبنی نہ تھا بلکہ کھلا ہوا تجربہ صاف اور واضح مشاہدہ پر اس کی بنیاد کھڑی کی گئی، دنیا نے دعویٰ کو سنا اور دلیل کو دیکھا، حیران ہیں کس کے ہوش قائم رہے کلیسا میں تزلزل پیدا ہوا لوتھر نے ایک ضرب شدید سے پوپی تنظیم کی بنیادوں کو ہلا دیا وہ خود بنا یا نہیں، لیکن قصر تثلیث کے ایک اہم حصہ کو اس نے اپنے ہاتھوں برباد کر دیا، کیا کوئی اس کا منکر ہو سکتا ہے کہ تثلیث کی یہ جزئی شکست اسی دعوے اور دلیل کا نتیجہ نہ تھا جس کی ابتدا عرب سے ہوئی اور کیا ان ہی میں جو یونیورسٹی پر آج خطبہ دے رہے ہیں وہ عالم کے اس سب سے بڑے انسان کے احسان سے سبکدوش ہو سکتے ہیں، شراب پر احتساب قائم کرنے والو! دیکھو حق سے آنکھیں نہ بند کرو۔ ترکستان میں کبیر کیوں پیدا ہوا، نانک کس دباؤ سے بے چین ہوا، رام موہن رائے کس کی گرفت سے مضطرب تھا اور آج ہندوستان کے طول و عرض میں جو وہ جماعت نظر آتی ہے جسے اسلام سے عداوت کا دعوٰے ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ بت شکنی میں بھی مصروف ہے۔ کیا اس عملی فرمان بردار ذہنی نافرمان فرقہ کو اس دعوے کے اثر سے آزاد کہہ سکتے ہیں؟

لیکن اثبات دعوے کا یہ ایک ایجابی پہلو تھا یعنی اس وقت تک یہ دکھایا گیا کہ

کچھ نہ تھا اور سب کچھ ہو گیا

مگر اثبات دعوے کا دوسرا رخ ابھی تشنہ تھا، ایجابی پہلو کا مشاہدہ ہو گیا، اور کامل طور پر ہوا، لیکن اسی کا سلبی پہلو یعنی

سب کچھ تھا اور کچھ نہ ہوا

دل چاہتا تھا کہ اس کا بھی معائنہ کرا دیا جاتا تو پھر حجت تمام ہو جاتی شک و ریب کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ایجابی پہلو کا تماشا تم نے مکہ کی وادی میں کیا، اب آؤ کربلا میں آؤ اور دیکھو کہ اس دعوے کی دلیل کا سلبی طور پر کس طرح مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔

محسوس قوتوں میں سب سے بڑی قوت سلطنت کی ہے ہم جس رقبہ کے بادشاہ ہیں اس علاقہ میں ہم سے بڑی قوت والا کون ہو سکتا ہے اور بادشاہوں سے تو رعایا کے کسی نہ کسی فریق کو کچھ نہ کچھ خصومت بھی ہوتی ہے یہ قوت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب شاہی کے بجائے شاہزادگی کا طرہ میرے سر پہ لہرا رہا ہو کہ شہزادہ رعایا کے لئے صرف مایہ امید اور بضاعت توقعات ہوتا ہے ہر شخص اس کی خوشامد میں اس لئے منہمک ہوتا ہے کہ آئندہ چل کر اس کی نگاہ کرم کا وہ مورد بنے، لیکن شاہوں کی شہزادوں کی حکومت تو صرف اجسام پر ہوتی ہے اس پیر یا مرشد کی قوت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو لوگوں کے جسموں پر نہیں بلکہ قلوب پر حکومت کرتا ہو اور پیری کا درجہ اس وقت کس قدر بلند ہو جاتا ہے جب وہ نبوت کی شان میں ظاہر ہو۔ یہ دنیا کی چوٹی کی قوتیں ہیں جنہیں ہم زور کہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کوئی طاقت ان طاقتوں سے بالاتر نہیں، پھر اس شخص کی قوت کو سوچو جو شہزادہ بھی اور دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا شہزادہ ہو، کیونکہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اس وقت بقول جرجی زیدان کرۂ زمین پر سب سے بڑی قوت دو ہی تھیں رومی دولت اور ایرانی سلطنت، جس قوم نے ان دونوں قوموں کو توڑ دیا۔ اس نے ساری زمین کی قوت توڑ دی۔ اور اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں اسلام دنیا کی سب سے بڑی قوت تھی۔ وہ اسی سلطنت کا شاہزادہ تھا، جہاں باغی رہتے تھے وہاں جانا تو شبہ کی گنجائش تھی۔ وہ شام نہیں بلکہ عراق آیا جو اس کے پدر بزرگوار کا پایۂ تخت تھا کوفیوں کے پاس آیا جو اس کے والد کے نمک خوار سپاہی تھے، اور صرف شہزادہ

نہیں بلکہ وہ ان کا پیرزادہ بھی تو تھا۔ کیا ان میں سے ہر ایک اس کے والد کرم اللہ وجہہ کو اپنا روحانی پیشوا نہیں جانتے تھے؟ کیا ان کی والدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کی نگاہوں میں سیدۃ النساء العالم نہیں تھیں؟ اور صرف پیرزادہ ہی تو نہیں وہ ان کا نبی زادہ بھی تو تھا، اور کیا نبی زادہ کو اس کے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ان کے قلوب میں کسی مخلوق کی عظمت کی گنجائش نہیں تھی۔

الغرض امام حسین رضی اللہ عنہ جس وقت کربلا تشریف لائے ہیں تو کون انکار کر سکتا ہے کہ اس وقت وہ شہزادے بھی تھے پیرزادے بھی تھے، نبی زادے بھی تھے، اور خود ان کے تقویٰ وورع، زہد وصفا کی عام دھاک دنیائے اسلام پر قائم تھی، ان قوتوں کے ساتھ وہ آتے ہیں اور اپنے والد کے پایۂ تخت میں آتے ہیں، اپنے والد کی فوج میں ان کی چھاؤنی میں آتے ہیں۔ سوچنا چاہیئے کہ قوت کی اتنی جہات کسی ایک شخصیت میں آج تک جمع ہوئی ہیں یا ہو سکتی ہیں؟ میں نے معمولی پیرزادوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ اس شہر یا گاؤں میں داخل ہوتے ہیں جہاں ان کے والد کے کل باشندے نہیں، بلکہ بعض لوگ مرید ہوتے ہیں، تو پھر ان کو ان مریدوں کی قوت پر جو ناز ہوتا ہے، شاید شہزادوں کو بھی اپنے ممالک محروسہ میں نہیں ہوتا۔ لیکن یہاں شہزادگی بھی ہے پیرزادگی بھی ہے، اور نبی زادگی بھی ہے، اور دنیا کی سب سے بڑی قوت کی طرف سے یہ امتیازات قدرتی طور پر ان کو حاصل ہیں۔ الغرض عالم محسوسات میں جو کچھ ممکن ہے وہ سب کچھ ہے۔

مگر اثبات دعوے کے اس تجربی پہلو کا مشاہدہ کرو جس کا نام میں نے سلبی شہادت رکھا ہے کہ باایں ہمہ قدرت وقوت، زور وطاقت دنیا نے دیکھا، آسمان نے دیکھا، زمین نے دیکھا اور قیامت تک دیکھتی رہے گی کہ کچھ نہ ہوا۔

امام حسین رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، ان کی نعش مبارک پامال ہوئی ان کا سر مبارک کاٹا گیا۔ سچ یہ ہے کہ محسوس قوتوں، عقلی وسیلوں خود ساختہ ذریعوں کو امام حسین رضی اللہ عنہ کے پاک خون نے جس طرح دھو کر دنیا سے ناپید کیا کسی نے نہیں کیا۔

اے شاہی جلال! تو بھی بے کار ہے، اے شاہزدگی! تیرے اندر بھی کچھ نہیں، اے پیرزادو! سوچو! ان بستیوں میں پہنچ کر سوچو! جہاں تمہارے خاندانی مرید بستے ہیں کہ ان محسوس قوتوں کی تہ میں نفی اور عدم کے سوا کچھ نہیں ہے، جو قوت محسوس ہو رہی ہے وہ کچھ نہیں ہے اور جو نہیں محسوس ہوتی وہی سب کچھ ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک من تشاء کے دعاوی کا اثبات عملی

اور تجربی شکل میں نانا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ابتدائی زندگی سے دیا اور نواسہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں بھی صرف اسی کا مشاہدہ کرایا۔ کیا حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے یہ غلط لکھا ہے کہ جو صورۃً کسی کے ساتھ مشابہ تھا وہ معنی بھی اسی کے فرائض کی تکمیل کر کے دنیا سے روانہ ہوا۔ "اللّٰہم صل علیٰ محمد وعلیٰ آلہ کما صلیت علیٰ ابراہیم وعلیٰ آل ابراہیم انک حمید مجید"

امامت کبریٰ

خلیل علیہ السلام نے بھی قربانی دی تھی، بیٹے کی قربانی دی تھی۔ اور بلاشبہ ان کی قربانی کامل تھی۔ لیکن پھر بھی اس کا اثر باطن سے ظاہر تک متجلی نہ ہوا۔ دیکھو! اس کے صلہ میں جو انعام انی جاعلک للناس اماماً کے ذریعہ سے بشکل امامت کبریٰ عطا ہوا اس میں بھی ظہور کی شان کس قدر مخفی رہی۔ یہ سچ ہے کہ عیسائی، یہودی مسلمان جو دنیا کی سب سے زیادہ مشہور قومیں ہیں وہ ابراہیم کو اپنا امام مانتی ہیں اور پارسیوں کا بھی دعویٰ ہے کہ ان کا وخشور اول (پیغمبر اول) وہ شخص تھا جس نے خانہ کعبہ کی بنیاد ڈالی۔ ہندو بھی کہتے ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا رشی برآہما تھا اسی کے منہ سے جو بات نکلی ہم اس کو وید کہتے ہیں، جیسا کہ بعض کہتے ہیں کہ ہندوؤں کا برہما وہی ہے جسے تورات میں ابرام اور ابراہام اور قرآن میں ابراہیم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور صحف ابراہیم جن کا سراغ قرآن سے تو ملتا ہے لیکن دنیا میں نہیں ملتا۔ اس شکل کے ساتھ بھی نہیں ملتا جس شکل میں تورات وانجیل وزبور ہے ممکن ہے کہ ترجمہ در ترجمہ ہو کر وید کی مفسوخ ومنسوخ شکل میں وہی صحیفے موجود ہوں اور اگر یہ ثابت بھی ہو جائے تو مورخ کے لئے یہ کس قدر مشکل ہے کہ بدھ کی تعلیمات کا سرچشمہ وید کو قرار دے۔ بہر حال مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں۔ میں تو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا اثر باطن سے ظاہر تک متعدی نہ ہو سکا، اس لئے ان کی امامت میں ظہور کا رنگ بہت ہلکا رہا۔ جو ان کو مانتے ہیں وہ براہ راست نہیں مانتے، اور جو نہیں مانتے، دوسروں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاید انہی کو مانتے ہیں۔ یہ تو منیٰ کی قربانی کا اثر تھا۔

پھر جو قربانی کربلا میں ہوئی وہاں باطن نے ظاہر کی، حقیقت نے مجاز کی شکل میں ظہور کیا۔ مینڈھا نہیں بلکہ خود امام حسین رضی اللہ عنہ ذبح ہوئے۔ خدا کے سامنے ذبح ہوئے، اس کی ساری قوتوں کے سامنے ذبح ہوئے، جبرئیل واسرافیل کے سامنے ذبح ہوئے، ملائکہ روحانیین اور ارواح مقربین کی آنکھوں کے نیچے ذبح ہوئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں ذبح ہوئے۔ دوسروں کے ہاتھ سے نہیں، اپنے نانا کی امت کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

ان نکات کو کون سمجھ سکتا ہے کہ یرموکیوں کے پاس حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے لئے کوئی نیزہ نہ تھا، قادسیہ کے کافروں کی کمر میں اس فضیلت تک پہنچانے کے لئے کوئی خنجر نہ تھا۔ کیا مصلحت تھی جس کے حکم کے سوا اور کسی کا کوئی حکم نہیں۔ اس کی کیا مرضی تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند علیہ السلام ذبح ہوں، اور ان ہی کی بنائی ہوئی جماعت کے ہاتھوں سے ذبح ہوں۔ تاریخوں میں جو یہ مرقوم ہے کہ جب امام علیہ السلام نے دریافت کیا کہ دشمنوں کا کیا حال ہے تو بالاتفاق آپ کو یہ خبر سنائی گئی کہ "اے امام قلوب آپ کے ساتھ ہیں لیکن ہاتھ آپ کے خلاف ہیں چلیں گے"

یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَ یَحْکُمُ مَا یُرِیدُ کی حکمت مطلقہ میں جو سوچتے ہیں وہ پاتے ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا دل اپنے بچہ کو ذبح کرتے وقت مضطرب نہ تھا، اگر مضطرب نہ تھا تو پھر ان کے لئے اجر کیا تھا؟ مضطرب ہو، اور نہ مضطرب ہو، ساری بنیاد تو اسی پر ہے۔ ورنہ کسائی اپنے جوان بچے کو جسے وہ پہچان بھی نہیں سکتی، اگر اس نے اپنے سینگ سے مار ڈالا، تو اس کے لئے کیا اجر ہے؟

بہرحال کربلا میں جو قربانی دی گئی، یہی ایک ایسی قربانی تھی جو باطن سے منتقل ہو کر ظاہر کے پردہ پر جلوہ پرداز ہوئی، جو اندر تھا وہی باہر بھی آگیا، حقیقت نے مجاز کو بھی حقیقت ہی کے رنگ میں رنگین کیا اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ اس قربانی والی امامت کبریٰ جیسا کہ باطن میں عام تھی تام تھی، اسی طرح ظاہر میں عام ہوئی، تام ہوئی، اس امامت والے امام کو "کافۃً للناس بشیرًا و نذیرًا" کی سند دی گئی تاکہ سب جانیں سب مانیں، اور پھر اس سند پہ ختم نبوت کی مہر لگائی گئی تاکہ براہ راست جانیں، براہ راست مانیں، درمیان میں کوئی واسطہ حائل نہ ہو، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی امامت کی شناخت میں لوگ وسائط و ذرائع کے محتاج ہیں، یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بیان سے، مسلمانوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کی امامت کے آگے گردنیں خم کیں، لیکن اس امامت کے لئے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں۔ کسی ذریعہ کی حاجت نہیں کیونکہ اس کے بعد واسطوں کی ضرورت نہیں۔ کسی ذریعہ کی حاجت نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد واسطوں کی پیدائش ہی بند کر دی گئی۔

اگرچہ اس کا تصفیہ کون کر سکتا ہے کہ ابراہیمؑ کے فرزند اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو امامت ملی، کیا وہ بھی اسی امامت کی ایک شان نہ تھی جس کی بشارت ابراہیمؑ کو دی گئی، جو بیٹے کو ملا کیا وہ باپ ہی کو نہ ملا، پھر اسی طرح ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ کربلا میں جو شہید ہوا، وہ بھی اسی ذبیح کا ایک جزو تھا جس کو منیٰ کے ایک گوشہ میں ذبح کرنے کے لئے خلیل علیہ السلام نے پچھاڑا تھا اسمٰعیلؑ نہیں شہید ہوئے تو حسین رضی اللہ عنہ جو اسحاقؑ کے نہیں بلکہ اسمٰعیلؑ ہی کے بچے تھے، کیا ان کی شہادت کو اسی مبتدا کی ہم خبر کہہ سکتے ہیں؟ عارفوں کے لئے ان اسرار میں کتنے لذائذ ہیں؟ جو پھل پیدا کرنے کے لئے سمندر سے آبخرے اڑاتا ہے، بادلوں کو جنبش میں لاتا ہے، مٹی کو لکڑی اور پتے اور آخر میں پھول کی شکل میں نمایاں کرتا ہے جو آدم کو خلیفہ بنانے کا ارادہ پہلے کر لیتا ہے، اور پھر ایک الزام سے ملزم بنا کر اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کیا کیا کرتا ہے۔ اور کن اغراض کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔

جس کے ابوین صالح تھے موسیٰ و خضر کو حکم ہوا کہ ان کے خزانہ کی حفاظت کریں۔ تاکہ باپ کی چیز بیٹے کو مل جائے، یہی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

ردامانت

"نہ تھا نیں کا جبار کچھ نہ تھا" اس میں ہونے کی نمائش ہوئی، وجود ملا، وجود کے لوازم ملے، زندگی ملی، قوت دید ملی، شنید ملی، چشید ملی، شمید ملی، گوشت اور ہڈی کے مرکب میں ان طاقتوں کی جلوہ نمایاں شروع ہوئیں اس کی پیٹھ مضبوط کی گئی۔ اس کے بازو میں زور بھرا گیا۔ اس کی زبان میں کہربائی اثرات دوڑائے گئے۔ وہ افریقہ کے اس سرسبز گوشہ کا سورما قرار پایا۔ اس نے سونے کا تخت بچھایا۔ اور اس پر بیٹھ کر اس نے محسوس کیا، کہ ملک مصر کی گردش اسی کے ارادہ اور مرضی کے نقاط پہ ہوتی ہے یہ کیا احساس تھا کہ اس نے اس کے دماغ کو الٹ دیا۔ اسے جو کچھ دیا گیا وہ محض ردامانت میں دیا گیا تھا۔ نظام دماغی کی معکوسی اثر کا اندازہ کرو، کہ وہ یکایک یہ باور کرنے لگا، کہ اسی نے سب کو دیا ہے، اور اس کا دینے والا کوئی نہیں ہے۔ خود فراموشی نے خودی کا رنگ اختیار کیا اور خیانت کے جنون میں بدمست ہو کر وہ انا ربکم الاعلیٰ بڑبڑانے لگا۔ جو ایک سکینڈ کے لئے بھی اپنی ذمہ داری پر اپنے پھیپھڑے کو ہلکی سی سانس نہیں دے سکتا تھا ایک بڑے ملک کے باشندوں کا۔ ان کے کھانے پینے، سونے، جاگنے، مرنے جینے، نفع نقصان کا ذمہ دار بن بیٹھا۔ اور اپنے کو ہر قسم کی ذمہ داری سے اس نے بالاتر قرار دیا۔ اس کی شخصیت پر وہی آسیب مسلط ہو گیا تھا جو آج کل بنی آدم کی بعض نسلوں کا گلا پکڑے ہوئے ہے وہ انفرادی فرعون تھا اور آج کرۂ زمین پر اجتماعی اور قومی فرعون کا بہ وزن ہوا ہے پہلے اس اژدہے نے نیل کے پانی سے سر نکالا تھا، اور آج افراد کو مٹا کر ذرا زیادہ شدت کے ساتھ جمہوریت کی شکل میں ٹیمز اور سین کے کنارے کرج رہا

ہے دونوں کی اسپرٹ ایک ہے، سانچوں اور قالبوں کے اختلاف پر اتنا زور نہ دیا کرو، اس کی شکایت نہیں ہے کہ انہیں وجود کیوں ملا، ان کی نیستی میں ہستی کی منور شعاعیں کیوں چمک رہی ہیں۔ ان میں بینائی شنوائی کے مظاہر کا ظہور کیوں ہوا، زمین پر ان کا رعب کیوں قائم ہے جانی اور مالی نقصان کے خوف سے دنیا والے ان کو اپنی آمدنی کے ایک حصہ کو دینے پر کیوں مجبور ہیں۔ یہ خوف جن آلات و اسلحہ کے زور سے پیدا ہوتا ہے وہ ان کو کیوں ملے۔

آخر ہم اس کا گلہ کیوں کریں ؟ کیا ہم دینے والے کے ملک میں ساجھی ہیں یا اس کا ہم سے کوئی ناطہ ہے۔ ہم پر اس کے حقوق ضرور ہیں لیکن اس پہ کون حق قائم کر سکتا ہے۔ اس نے تمہارا کیا دیا، جو تم اس طرح روتے اور آنکھیں بسورتے ہو، اپنی چیز دی ہے اپنی قوت دی ہے، اپنا ساز و سامان دیا ہے، کیا واقعی ہمیشہ اس کی مصلحت وہی ہوتی ہے جو اس نادان بدھی کے نزدیک تھی اور کہتی تھی کہ اے خدا مجھے دے اور میرے بیٹے کو لیکن کیا دوسروں کے لئے تو قرض کرے گا۔

ہم جس پر متعجب ہیں اور یہی تعجب کبھی غصہ کی اور کبھی تعصب کی کبھی عداوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ یہ دیوانے اپنے کو، اپنے علمی و عملی ذخیروں کو اپنا کیوں سمجھتے ہیں، امانت میں خیانت کیوں کر رہے ہیں۔ مجرم سے انسانی فطرت بیزار ہوتی ہے، چور کو کون دوست رکھتا ہے، ڈاکوؤں سے کسے عداوت نہیں، خود مجرم بھی تو اپنے جرم سے راضی نہیں، اپنے جرم کے وصف عنوانی سے موصوف ہونے کو اپنی اہانت خیال کرتا ہے، جو زانی ہے اس کو زانی کے خطاب سے مخاطب کرو، اور بشری جذبہ کی طبعی مدافعت کا اندازہ کرو، کم از کم اپنی محافظت کے لئے تم کو تعبیر کے بدلنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ جس طرح آج یورپ قبائح وسئیات کی حرارت کو محاسن و حسنات کے خوبصورت عنوانوں اور تعبیروں سے ٹھنڈی کرتا ہے۔ پھر اگر ہم خائنوں سے کڑھتے ہیں ان کی ہر حرکت و سکون سے ہمیں نفرت ہے تو کیا سلیم فطرت اس کے سوا اور بھی کچھ کر سکتی ہے —— تم سمجھتے ہو کہ انہوں نے ہم سے ہمارا ملک لیا ہے! ہماری دولت لی ہے، ہماری شوکت لی ہے۔ اس لئے ہم ان سے بیزار ہیں، جو ملک کو اپنا ملک اور دولت کو اپنی دولت سمجھتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ ایک دوسرے سے اسی لئے چڑھتے ہوں

لیکن ہم سے تو ترکوں نے پٹھانوں نے، مغلوں نے اور خدا جانے کن کن لوگوں نے دولت بھی لی، سلطنت بھی لی، سب کچھ لیا، پھر کیا ہم میں کوئی اس وقت تک ان سے بیزار ہوا، جب تک کہ ہم نے اپنے کو اپنا نہیں سمجھا بہرحال میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ میری غرض تو یہ تھی کہ مصر کے محدود رقبہ میں جس کے پس پشت قوت کی نمائش ہوئی تھی اور جس کے غلط انتساب نے غلطیوں کا انبار قائم کر دیا تھا، کیا تماشا ہے وہ اس کو واپس نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن یکایک سب کی سب واپس لے لی گئی، پانی کے باہر اس کا سب کچھ تھا۔ مگر چند قدم فاصلہ سے پانی کے اندر اس کا کچھ نہ رہا، اور

کم ترکوا من جنت و عیون و زروع و مقام کریم و نعمۃ کانوا فیہا فاکہین (اور کتنے باغ، کتنے سرچشمے اور کتنے پرشکوہ بنگلے اور وہ ساری نعمتیں جن میں وہ مزے لے رہے تھے، چھوڑ بیٹھے)

ان چیزوں کو امانت سمجھ کر اس نے صاحب امانت کی طرف خود نہیں لوٹایا، بلکہ اس سے زبردستی یہ چیزیں چھینی گئیں۔ پھر کیا اس دردناک سانحہ پر کوئی رویا، کسی دل میں افسوس کا جذبہ ابھرا۔ ان پر کسی نے آنسو بہائے ان کے لئے کوئی چیخا ؟ یہ سچ ہے کہ آج جو اس کے گدی نشین اور اس کے دماغی مرض کے وارث ہیں، وہ اس کی اور اس کے آباؤ اجداد، اس کے امرا اس کے وزراء کی قبروں کی جستجو میں سرگرداں ہیں، خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو جو زندہ اجسام کی اعانت کے لئے دی گئی ہیں، وہ مردہ لاشوں کی تلاش میں صرف کر رہے ہیں، مصر میں مردوں کو ڈھونڈا جاتا ہے، اور زندوں کی گردنیں مروڑی جاتی ہیں، اور جس طرح نوحؑ و ابراہیمؑ، موسیٰ و عیسیٰ کے وارثوں نے اپنے بزرگوں کے نام پاک کام سے معمورۂ عالم کو بھر دیا ہے، اسی طرح یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان گمنام، ملعون مورثوں کے سیاہ کارناموں کو علی الرغم روشن کریں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اور بڑے تزک و احتشام سے ہو رہا ہے، لیکن خدارا بتاؤ کہ ان میں سے ان ڈوبنے والوں کی لاش پہ کون رویا ان کی اونچی محلسراؤں پہ کون آبدیدہ ہوا، ان کی فراواں دولت کے ڈھیر پر کس نے ڈھاڑھیں ماریں، تم دیکھو! یا نہ دیکھو، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اپنے بزرگوں کی لاشوں سے یہ مداری کے بندروں کا کام لیتے ہیں، میوزیم میں رکھتے ہیں، ٹکٹ لگاتے ہیں، پیسے وصول کرتے ہیں، ان کے کفن کے ساز و سامان کے چرانے میں ایک دوسرے پر کتے کی طرح غراتے ہیں اور واقعہ ہے کہ خائن مجرم تھا، مجرم نے جرم کی سزا پائی، پھر اس پر کون رو سکتا ہے۔ صدق مولانا الکریم۔

فما بکت علیہم السماء والارض (حق سبحانہ تعالیٰ)

پھر نہ ان پر آسمانوں نے گریہ کیا اور نہ زمین روئی۔

لیکن اس کے مقابلے میں جو فرات کے ساحل میں آیا، اپنے کو لے کر آیا۔ اپنی آنکھوں اور کانوں کو لے کر آیا، اپنی قوتوں کو لے کر آیا، اپنے تمام اعضا کو لے کر آیا، اپنے بال بچوں سمیت آیا، اپنی عزت و آبرو اپنے ناموس کو لے کر آیا، اپنی شاہزادگی کی طاقت، پیرزادگی کے اعتماد کو لے کر آیا، اپنی نبی زادگی کے جلال کو لے کر آیا، بلکہ خود اپنے زہد و تقویٰ ولایت و ہمت کی

قرنوں کو یہ کہ آیا ، زبردستی نہیں ، بلکہ راضی سے آیا ، خوشی سے آیا ، اور کہنے والوں نے روکا ، لیکن وہ بے تحاشا دوڑا امانت کے لئے امتحان کے میدان میں جا پہنچے کے جنگل میں اتر گیا ، کیا وہ شامیوں کے خلافتی تخت کے لئے اترا ، بنی امیہ کے پاس مٹی کی بالائی سطح کا جو چھلکا تھا ، کیا وہ اس کے لئے آیا ، کیا واقعی اس کے سامنے ابن زیاد تھا ، یا یزید کا سپہ سالار تھا ؟ لوگ کچھ ہی سمجھیں ، لیکن عارفوں نے دیکھا تھا اور جیسا کہ تاریخوں میں بھی ہے کہ وہ صف جنگ میں .

"لا الہ الا اللہ سبحان اللہ وبحمدہ"

کا نعرہ لگا رہا تھا - پس کون جان جا سکتا ہے کہ کس لئے آیا تھا اور کس کے سامنے آیا تھا ، اور یہ لین دین کن دو ہستیوں کے درمیان ہے ؟ اس پہ پانی بند کیا گیا - اس کے خشک ہونٹ ، سوکھی زبان اس کی کب بھی جو پیدا کرتا اس سے اعزہ کی گردنیں مانگی گئیں ، اس نے واپس کر دیں ، اس سے ننھے بچوں کا خون طلب کیا گیا ، اس نے حاضر کر دیا - اس پہ تیروں کی بارش ہوئی اس نے قبول کیا - اس کا جسم چھید گیا ، وہ دم بخود کھڑا رہا - اس کے جسم پر تلوار کی دھار ماری گئی ، وہ سر جھکائے کھڑا تھا - اس کے سر سے گردن الگ کی گئی اور اس خدا کے سامنے الگ کی گئی جو اس کے ساتھ پھر کیا اس نے انکار کیا ؟ اس کے گھر کا ادنیٰ خادم مقتول ملا ، کہا تھا فہیرہ بن مالک کی لاش کو ملکوت والوں نے چھپا لیا ، لیکن اسی گھر کا جو سردار تھا . اس کی نعش مبارک پر گھوڑوں نے ٹاپ مارے ، اس کی ہڈیوں کو کچلا اور آسانی کے ساتھ یہ مراحل طے ہو گئے ، آخر میں اس کی عزت و ناموس پر بھی حملہ کیا گیا ، اس کے گھر کی خاتونوں کو جو جنت خاتون کی لخت جگر تھیں ان کو رسیوں میں باندھا گیا ، زمین پر گھسیٹا گیا اور یوں اس کو جو کچھ دیا گیا تھا ، ہنستے ہوئے چہرے ، مسکراتے ہوئے لبوں کے ساتھ اس نے سب واپس کر دیا اور ان تؤدوا الامانات الیٰ اہلہا کی ایک ابدی تفسیر جریدۂ عالم پر اسی کی بدولت ثبت ہوئی - نہ اتنا کسی کو ملا اور نہ اتنا کسی نے دیا - کون اندازہ کرے اس شخص کی نعمتوں کا کون اندازہ کرے ، جو خالق کے محبوب کا محبوب تھا - وہ اس کا پیارا تھا - اس کے کندھے پر کھیلنے والا تھا - اس کی پشت مبارک کا سوار تھا - اس کے لب ہائے اقدس کا وہ بوسہ گاہ تھا ، کیا آفتاب اس کے حکم کا منتظر نہ تھا ، زمین اس کے آگے جھکی ہوئی نہ تھی ، جبرئیل امین اس کے فرمان سے سرتابی کر سکتے تھے ، فرات اس کا نہ تھا تو پھر کس کا تھا ، لوگ کہتے ہیں کہ اس نے میدان کربلا میں تلوار چلائی ، نیزہ کو جنبش دی ، حالانکہ کیا کسی مستند تاریخ سے اس کو ثابت کر سکتے ہیں ، اس کی تلوار کی باڑھ کون سنبھال سکتا تھا جب اس کے الفاظ کی برداشت کی صلاحیت کسی میں نہ تھی - قاسم نے جب یا عم کہہ کر پکارا اور ضبط نہ ہو سکا کس نے نہیں دیکھا کہ قاتل کا گھوڑا اپنے سوار کو پیٹھ سے گرا کر گھسیٹتا جاتا تھا اور چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر اس کی لاش پارہ پارہ ہو گئی ——— بہر حال نہر کے کنارے خائن سے امانت چھینی گئی ، پھر نہ اس پر آسمان رویا اور نہ زمین روئی ، اور فرات کے ساحل پہ امین صادق نے امانت واپس کی پھر دیکھو ! اس پہ دنیا روئی ، قوموں نے ماتم کیا ، نسلوں نے آنکھوں سے آنسو بہائے ، صدیوں نے اس کے نوحہ کو سنا ، قرنوں میں اس کا گریہ و بکا گونج رہا ہے . افغانستان سے کراہ کی آواز آ رہی ہے ، ٹیونس والوں کا دل پانی ہو رہا ہے ہندوستان کے اکثر شہر اور اس کی بستیوں میں نالے بلند ہو رہے ہیں ، ایران کا کلیجہ پھٹ رہا ہے عرب کی آنکھوں میں بھی آنسو بھرے ہوئے مصری بھی بے چین ہیں .

الغرض جس نے امانت میں خیانت کی تھی ، اس پر ، اس کے جاہ و حشم پہ ، مال و دولت پہ ، نہ آسمان رویا ، نہ زمین روئی ، اور جس نے امانت کو پوری قوت کے ساتھ ، نہایت صفائی کے ساتھ بغیر کسی آلودگی کے واپس کیا ، اس پہ عرب و عجم سب کے سب مصروف گریہ و بکا ہیں ، صدیوں سے ہیں ، قرنوں سے ہیں اور اب تو اس پہ تیرہ سو برس گزر چکے ہیں یہ رونا نہ تھمے گا ، یہ ماتم نہ ختم ہو گا .

کون ہے ؟ نسل انسانی میں کون ہے ، جس پہ آسمان و زمین تو خیر آسمان و زمین جس کے لئے ہے یعنی بنی نوع انسانی نے اس پہ غم کا اظہار اس طرح کیا ہو ، کیا ہندو کسی پر اس طرح روئے ، کیا عیسائی اپنے کسی شہید پر اس درجہ غم زدہ ہوئے ، کیا بدھ کے پیروؤں میں اس کی کوئی نظیر ہے ، کیا یہودیوں کا کوئی شہید اتنا مشہور اتنا بلند ہے - کیا پارسیوں کی محدود جماعت کی کوئی قربانی اس احترام کی مستحق قرار پائی ؟ پرانی تاریخوں میں بلاشبہ ایسے قتیل نظر آتے ہیں جن کے خون کو دیکھ کر انسانی فطرت بہت مضطرب ہوئی ہے ، اور کچھ دن کے لئے کسی مخصوص ملک کے کسی خاص علاقہ میں اس اضطراب نے آنسوؤں کی شکل اختیار کی لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی وسعت زمانی و مکانی اتنی گہری اور عمیق غمناکی کی نظیر تاریخ میں کون دکھا سکتا ہے ؟ اور یہی مراد ہے - سر الشہادتین میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت جہری شہادت تھی ، اور اسی وجہ سے شہرت میں اتنا بلند رتبہ حاصل کیا ——— "خائن" کے متعلق جب قرآن مجید کا نص قطعی وارد ہے "ما بکت علیہم السماء والارض" اور محل طعن و ملامت میں واقع ہے ، تو کیا جس شخص پر آسمان و زمین سے بھی زیادہ گرامی ہستیاں روئیں ، اس سے اس کی تعریف و تقدیس نہیں نکلتی ؟

یہ سچ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ نے ارشاد فرمایا .

انا بریٔ ممن حلق وصلق وخرق

(بخاری و مسلم)

جس نے مردہ کے ماتم میں سر منڈایا اور
زور زور سے چیخا اور کپڑے پھاڑے
میں اس سے بری ہوں ،

اور بلاشبہ حدیث میں ہے کہ:-

لیس منا من ضرب الخدود وشق الجیوب ودعٰی بدعوی الجاھلیۃ (بخاری)

جو گلوں پر طمانچے مارتا ہے یا گریبان پھاڑتا ہے یا جاہلیت والوں کی طرح بین کرتا ہے وہ ہم میں سے نہیں۔

پھر کیا ان حدیثوں کے بعد بھی میں ان نادانوں کی تائید کروں گا جو اپنے سینوں پر لوہے کی زنجیریں ٹپکتے ہیں یا اپنے بال نوچتے ہیں یا مصنوعی آوازوں کے ساتھ ایام جاہلیت کے دستور کے مطابق ڈھاریں مارتے ہیں۔ میں ان سے کہوں گا جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے سعدؓ بن عبادہ کی عیادت کے وقت صحابہؓ کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا تھا۔

الا تسمعون ان اللہ لا یعذب بدمع العین ولا بحزن القلب ولکن یعذب بھذا او اشار الی لسانہ (بخاری ومسلم)

کیا تم لوگ نہیں سنتے ہو۔ اللہ تعالٰی آنکھوں کے آنسوؤں یا دل کی کراہ پر سزا نہیں کرتا بلکہ اس کی سزا اس پر ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔

مطلب یہ ہے کہ چیخ پکار، بین اور ہنگامہ ناسرا اور ناجائز امور ہیں۔ لیکن دل کی رقت، طبیعت کے ہیجان، آنسوؤں کے سیلان کو کون روک سکتا ہے بلکہ روکنے والے کو ذرا سنبھل کر سوچنا چاہیئے کہ وہ کہیں ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو تو نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ بخاری میں ہے کہ جب ابراہیم ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزع طاری ہوا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اس پر عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالٰی عنہ نے دریافت کیا کہ وانت یا رسول اللہ۔ آپ یا رسول اللہ روتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا انھا رحمۃ (یہ رحم اور ترس ہے) اتنا فرمایا تھا کہ پھر آنکھوں سے دوسرا سلسلہ جاری ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم روتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے آنکھیں آنسو بہاتی ہیں، دل غمناک، اور ہم نہیں کہتے لیکن وہی ہمارے رب کی مرضی ہو۔ مخصوص دنوں میں اپنے کو رونے پر تم کیوں آمادہ کرتے ہو؟ کیا کربلا کا حادثہ ایسا حادثہ ہے، جس پر دل کی غم انگیزی کبھی ختم ہوسکتی ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ماہ محرم میں یہ واقعہ زیادہ یاد آتا ہے اور یہ قدرتی امر ہے، ممکن ہے کہ اس موسم میں جگر کی ٹیس زیادہ بڑھ جائے، دل میں زیادہ شدت کے ساتھ ہوک اٹھے، اندرونی بے چینیاں، بیرونی آنسوؤں کی شکل اختیار کریں، لیکن اس غم کے لئے دن کیوں بناتے ہو، جو غیر محدود سوز کا طالب ہے اس کو محدود بنا کر تنگ کیوں کرتے ہو؟

اور میں تم پر کیا ملامت کروں، کہ اب تو ہمارے دشمن اور ان دشمنوں کے سحر سے مسحور ہو کر خود ہمارے گھر میں ایسے لوگ ہیں جو اس جہری شہادت کو ستری بنانے کی فکر میں مصروف ہیں بلکہ ان میں کتنے ہیں، جو اس شہادت کو شہادت کے درجے سے گرانا چاہتے ہیں، وہ اب مشورہ دے رہے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کو یہ نہ کرنا چاہیئے اور ان کو یہ کرنا زیادہ مناسب تھا۔ چھپن سال کے بزرگ امام علیہ السلام تیرہ سو برس کے بعد ان پیشہ ور مورخین کے مشوروں کے کس حد تک محتاج ہیں، اس کا تصفیہ خود ان کی عقل کر سکتی ہے۔

لیکن میں تو حضرت شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کی اس نکتہ شناس طبیعت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے سرالشہادتین میں لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہادت دراصل فضائل و کمالات کے سلسلے میں ایک اہم حقیقت ہے، اور "نبوت کبریٰ" جو تمام فضائل و کمالات کی آخری حد ہے، ضرور تھا، کہ اس میں یہ کمال بھی شریک ہو، لیکن "منصب نبوت" کی شان عالی میں اس سے اختلال کا اندیشہ تھا۔ اس لئے قدرت نے اس کمال کو بجائے باپ کے بیٹے کی طرف منتقل کر دیا، شاہ صاحب نے صحیح حدیثوں سے امام حسین علیہ السلام کا فقط نواسہ ہونا نہیں، بلکہ "ابن" بیٹا ہونا ثابت کیا ہے اور عقلی طور پر اپنے اس دعوے کو اس سے مدلل کیا ہے کہ حضرت امام علیہ السلام اپنے جسم کے نصف حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خلقتہً بہت زیادہ اشبہ تھے۔

پس جو کمال بیٹے کو ملا، وہ باپ ہی کو ملا، کیونکہ گو انجیل میں ہے کہ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب بیٹے کا ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ بیٹے کا ہے سب باپ کا ہے۔ اور اس بنیاد پر شاہ صاحب کا یہ قول بالکل درست ہے کہ جو فضیلت امام حسن علیہ السلام کو حاصل ہوئی وہ دراصل سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں داخل سمجھی جائے گی۔ بہرحال شاہ صاحب نے یہ کس قدر صحیح ارقام فرمایا ہے کہ "فضیلت شہادت" سے منصب نبوت میں اختلال کا اندیشہ تھا۔

میں دیکھتا ہوں کہ یہی فضیلت جب نبوت سے ہٹ کر امامت پر اور باپ سے ہٹ کر بیٹے کو ملی، تو ہمارے دلوں میں وسوسوں کے کتنے سمندر موج مارنے لگے، خصوصاً آج کتنے ہیں، جو اتفاقی واقعہ کہہ کر اس کی اہمیت کے گھٹانے کے درپے ہیں، اور ان میں ایسے بہت ہیں جو علانیہ کہہ رہے ہیں کہ جب حکومت و سلطنت سے مغلوب ہو کر کربلا میں شہید کا خون بہا ظالم یہ وہیں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ اپنی خانگی صحبتوں میں اس کو جذبہ ضد اور ہٹ دھرمی کا ایک کرشمہ سمجھتے ہیں، ان کو امام کی ولایت میں بھی شبہ پیدا ہوتا ہے وہ امام ہمام سیدالشہدا علیہ السلام کے متعلق وہی باتیں، سوچتے ہیں

جو عصر حاضر کے گم کردہ راہ پیرزادوں کے متعلق دیکھتے ہیں۔ اور ان اوہام وسوسوں کی بنیاد کیا ہے؟ وہی فضیلت شہادت، جو باپ کی جگہ بیٹے کو ملی، اگر امام حسین علیہ السلام کربلا میں ان خصوصیتوں کے ساتھ شہید نہ ہوتے تو ان وسوسوں کی کہاں گنجائش تھی؟

پھر غور کرو، کہ اگر یہی شہادت خاص ذاتِ نبوت کے ساتھ ظاہر ہوتی تو ان بیماروں کے ایمان کا کہاں ٹھکانا تھا۔ اس وقت تو ان کو بیٹے کے عقل و اخلاق میں نقص نظر آتا ہے، تو اسی عیب سے وہ باپ کو بری رکھنے پر قادر تھے۔ ان کی بربادی تھی اور کیسی بربادی تھی۔ اور اب بھی وہ کب بربادی سے بچے ہوئے ہیں۔ انہوں نے پھل پر اعتراض کیا ہے تو کیا وہ بھول گئے کہ درخت ان کی زبان کی برچھیوں سے محفوظ رہا پھل اور کیسا پھل، جس نے بتول رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے آغوش میں پرورش پائی، حیدر کرار کی نگرانی میں ہوش سنبھالا، بلکہ سچ یہ ہے کہ جس کو دنیا کے سب سے بڑے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کی طرح پالا اور باپ کی طرح نگہداشت کی، وہی جسے ابوبکر صدیق رضؓ نے ہمیشہ پیار کے ساتھ وہ سب کچھ سکھایا جو اس کے نانا صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا فاروق اعظم رضؓ کی توجہ جس پر اپنے بچوں سے زیادہ تھی، ذوالنورین رضؓ کو جو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا اور سارے صحابہ کی آنکھوں کا جو نور تھا۔ ان درختوں کی مجموعی قوت سے جو پھل پیدا ہوا تھا، افسوس ہے، تم پر افسوس ہے کہ تم کو کسی اور کی عقل میں تاریکی نظر نہیں آئی، کسی اور کے اخلاق میں ہٹ اور ضد کی کدورت تم کو معلوم نہ ہوئی، اور معلوم ہوئی، تو کہاں معلوم ہوئی، تمہارے ریسرچ ورک (تفتیشی مجاہدات) کے لئے تو بڑا میدان تھا، پھر اسی وادی پُرخار میں اترنے کی کیا ضرورت تھی؟

جس نے پچپن سال کی عمر رضا و تسلیم، خاموشی، اور خلوت میں گزار دی، جس نے باوجود عمدہ گھوڑوں اور پُرشوکت سواریوں کے، ایک دفعہ نہیں، دس دفعہ نہیں، بلکہ پچیس دفعہ ڈھائی سو میل کی مسافت طے کر کے اللہ کے گھر کا حج کیا، جس نے تین دفعہ اپنی ساری مملوکات سے دستبردار ہوکر بے خانماں ہوکر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ تم اس کے متعلق ایسے بُرے خیالات پکاتے ہو فرات کے کنارے تو (العیاذ باللہ) وہ یزید کی دولت کو دیکھ کر آیا تھا۔ لیکن مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ پچیس دفعہ پیادہ پا کس غرض کو سامنے رکھ کر آتا رہا۔ اس کا کیا منصوبہ تھا۔ جب اس نے اپنی ساری جائداد کو تین دفعہ اللہ کی راہ میں لٹا۔

شاہی طاقت پہلے جسموں کو جھکاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا دباؤ عقل پر پڑتا ہے۔ عقلی ربودگی کے ساتھ ہی وہ بھی جھک جاتا ہے۔۔۔ جس کے جھک جانے کے بعد ہر چیز جھک جاتی ہے۔ آخر جب دل ہی جھک گیا تو اب آدمی میں کونسی چیز باقی رہ جاتی ہے جو نہ جھکے۔ جذبات، ارادات، خیالات حرکات، سکنات، سب کے سب ان سیاسی بازیگروں کی انگلیوں پر ناچتے ہیں جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ہوتی ہے۔

انسانیت کے لئے سب سے بڑی مصیبت اس وقت ہوتی ہے جب ان بازی گروں کے باطن میں خبث و شرارت کے عناصر غالب ہوتے ہیں، کہ اس وقت صرف وہی خبیث نہیں ہوتے، بلکہ وہ ساری روحیں جو ان کے سیاسی پنجوں میں گرفتار ہوتی ہیں سب کی سب گندی اور ناپاک ہوجاتی ہیں

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کے فوارے بہا کر انسانوں کی ایک جماعت تیار کی تھی، جس کے پاس صاف سینہ پاک روح مقدس نفس، سلیم قلب، عمیق علم، مستقیم عقل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ ایسی پختہ، ٹھوس، مستحکم، غیر متزلزل جماعت تیار ہوئی تھی کہ اس کے بعد یہ توقع بے محل نہ تھی کہ جو نسلیں ان سے نکلیں گی۔ ان میں ان کمالات و فضائل کے جواہر قیامت تک چمکتے رہیں گے۔ کہ یکایک اُمیہ کے گھرانے میں وہ بچہ پیدا ہوا جس نے اجسام کو قابو میں لاکر عقلوں پر قبضہ جمایا اور بالآخر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں قلوب و ارواح بھی "نبوت کبریٰ" کے قائم کئے ہوئے مرکز ثقل سے ہٹ نہ جائیں، اور اندیشہ کیا، جب ان میں ابن زیادہ، عمرو بن سعد، شمر پیدا ہوچکے تھے، تو کیا اس کے بعد بھی ہم اس کو فقط اندیشہ ہی سے تعبیر کرتے رہیں گے؟ کیسا خطرناک وقت، کتنی سخت گھڑی! کہ درخت کی شاخوں کو نہیں بلکہ اس کی جڑوں کے ہل جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ کیا کیا جاتا؟ ایسے وقت میں کیا کیا جاتا؟ کیا یزید کی گردن اڑا دینے سے یزید مر جاتا؟ یزید مر جاتا لیکن اس کی روح کس طرح مرتی جس کا وزن اُمت کے دل پر، دماغ پر، عقل پر پڑ رہا تھا؟ یہ خدا کی سجھائی ہوئی حکمت تھی کہ مسلمانوں میں جو سب سے بڑا تھا، ان میں سب سے زیادہ ذی اثر، با اقتدار تھا، اُن کا سب سے زیادہ پیارا محبوب تھا۔ وہ فاطمہ رضؓ کے حجرہ سے نکلا اور بجائے یزید کے خود اپنے گلوئے مبارک پر خنجر چلوا دیا۔ سر مبارک تن سے کیا علیحدہ ہوا، کہ مسلمانوں کے مسخر قلوب، ان کی مسحور عقلیں، ان کا سویا ہوا دماغ یکایک یزید کے عقلی اور ذہنی دباؤ سے علیحدہ ہوگیا۔ بظاہر یزید زندہ رہا۔ لیکن عارفوں نے دیکھا کہ اس کی روح مر گئی، اور یہی مقصد بھی تھا، نانا کی دیوار کو کون سنبھالتا؟ حسین رضؓ نہ سنبھالتے تو پھر کس کا زہرہ تھا، کہ اس میدان میں اُترتا اور خود اپنے خون سے اس دیوار کی ہلی ہوئی چٹانوں کو پھر مضبوطی کے ساتھ جما دیتا؟ حاجی محمد علی سچ فرماتے ہیں ؎

قتل حسین رضؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

جب یزید کی روح زندہ تھی تو اس سے کوفیوں کی فوج پیدا ہوئی

اور جب حسین علیہ السلام کو حیات جاوید بخشا گیا تو دیکھو! اُسی کوفہ سے ابراہیم نخعی، حماد، ابو حنیفہ، شعبی جیسے اکابر و حاشین نکلتے چلے آتے ہیں۔ اور صرف کوفہ کیا، کربلا کے بعد جو بھی آئے، اور جہاں بھی آئے، جس شان میں بھی آئے جنید بن کر آئے، یا شافعی، امام مالک کی شکل میں نمودار ہوئے، یا سفیان ثوری کے لباس میں۔ یہ سب اُسی زندہ روح کی ہمت مردانہ کا نتیجہ تھا — امام کی عظمت کون پیدا کرسکتا ہے؟ اس بلند مینارے پر کون قدم جما سکتا ہے، جس پر حسین علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے۔ ایسی ہمہ گیری بزرگی کس کے حصہ میں آسکتی ہے۔ کہ جس کا انتقام دنیا صدیوں سے لے رہی ہے اور اب تک انتقام پورا نہیں ہوا ہے۔ قرنوں سے نفرت کی موسلا دھار بارش یزید اور اس کے ساتھیوں پر ہو رہی ہے، لیکن تشنگی نہیں بجھتی۔ جس طرح پہلی صدی ہجری میں اس کے اعمال سے لوگوں نے بیزاری ظاہر کی۔ آج تک وہ بیزاری اسی آن بان کے ساتھ قائم ہے، کتنا گہرا کتنا پختہ رنگ اے خون حسین علیہ اسلام تو نے پیدا کیا۔ فرضی اللہ عنک وعن اصحابک۔ اُمت مرحومہ یوں تو آپ کے گھرانے کے فیوض و برکات میں از سرتا بہ قدم غرق ہے اور رہے گی لیکن اُن احسانوں میں کتنا بڑا احسان ہے جو آپ نے ہم بیکسوں کے ساتھ کیا۔ اگرچہ آپ نبی نہیں تھا۔ لیکن نبی زادے ہیں، اور اسی لئے آپ سے وہ کام بن آیا جو اُولوالعزم من الرسل کے شایان شان ہے۔ فجزے اللہ عنا دعن المسلمین خیر الجزاء!

آج اسلام کا جہاز پھر اسی گرداب میں آپھنسا ہے اپھر مسلمانوں کے اجسام اور اجسام کے بعد عقول، عقول کے ساتھ قلوب غیر اسلامی اثرات کے نیچے دبے چلے جاتے ہیں، لیکن ایسا کون با اثر ہے۔ اتنا اقتدار کس کو حاصل ہے، جو اپنے سر کو علیحدہ کر کے قلوب کو بھی اُن سے علیحدہ کرلے ہ؟ اٹھے گا، فاطمہ رضی کے گھرانے سے کوئی اٹھے گا۔ روحیں اجنبی دباؤ کے نیچے میں اب زیادہ دیر تک نہ پھڑ پھڑائیں گی۔ قلوب غیروں کے وزن کو شاید اب زیادہ مدت تک نہ محسوس کریں گے۔ عقول کفر کی راہوں میں اپنے لئے روشنی نہ تلاش کریں گی۔ فتر تصبوا انا معکم من المتربصین۔

میں اور بھی کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن جو کچھ دل میں ہو کیا زبان یا قلم پر سب کا آنا ضروری ہے؟ ہزار نکتہ باریک تر ز مو اینجاست، بعض باتیں عام کی جاتی ہیں۔ اور بعضوں کے لئے صرف اہل کی ضرورت ہے۔ نفع اٹھانے والوں کیلئے اس میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کم نہیں ہے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل؛



بقیہ : شذرہ

تو یہ فرماتے ہیں۔ خبردار! میں وزیر ہوں یعنی "مرفوع القلم" ہوں — حال ہی میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب حنیف رامے صاحب نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں ان لیڈروں کی فہرست پیش کی ہے جن کے لب و لہجہ سے بقول ان کے دُشنام کی بُو آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ تمام لیڈروں کو مل کر ایک ضابطۂ اخلاق بنانا چاہیے — ہم اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہیں اور موصوف سے نہایت ادب و احترام سے عرض کرتے ہیں کہ اس ملک اور قوم پر رحم فرمایئے اور خود بھی ضابطۂ اخلاق کی پابندی کیجئے۔ آپ نے جن لیڈروں کی فہرست پیش کی ہے اُن میں قائد جمعیت مولانا مفتی محمود کا نام نہیں لیا گیا۔ ہم پورے وثوق اور ذمہ داری سے اعلان کرتے ہیں کہ مفتی محمود صاحب نے سیاسی یا مذہبی میدان میں ایک جملہ بھی غیر ذمہ دارانہ نہیں کہا بلکہ ہم یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ مفتی محمود پاکستان کے سب سے زیادہ سنجیدہ اور متین لیڈر ہیں لیکن اس کے باوجود آپ نے مفتی محمود صاحب کو "سرمایہ داروں کا ایجنٹ" کہنا اپنا وظیفہ مغفرت بنا لیا ہے جسے درست کہنے یا سمجھنے کا ہمیں اخلاقی اور قانونی جواز نظر نہیں آتا ہے۔ جبکہ یہ سب کچھ یک طرفہ طور پر ہو رہا ہے اور مفتی صاحب ان غلط باتوں کا نوٹس تک نہیں لیتے ؎

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے عتاب جرم سخن سے پہلے

بہر حال آپ سے آخری التماس یہی ہے کہ جس طرح آپ نے اپنی وسیع النظری کا ثبوت دیتے ہوئے جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور سے معافی مانگ لی تھی اسی طرح قائد جمعیت مولانا مفتی سے بھی معافی مانگ لیں۔ اس سے آپ کی عزت میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

قاسم العلوم انجمن خدام الدین لاہور

جمعیۃ طلباء اسلام کے اجتماع لائلپور کے موقعہ پر احقر عبید اللہ انور کی گزارش

طلبائے گرامی قدر کے نام:

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ

پس خدا بر ما نبوت ختم کرد

بر رسول ما رسالت ختم کرد

خدمت ساقی گری بر ما گزاشت

داد ما را آخریں جامے کہ داشت

خالق کائنات نے سیدنا عیسیٰؑ کے بعد "انسان کامل" کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جن پر دین کو تمام کر دیا گیا اور نبوت و رسالت کے عہدے کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا کہ محمد مصطفیٰ خاتم النبیین ہیں اب تا قیام قیامت آپ کی لائی ہوئی ہدایت ہر اعتبار سے کامل و اکمل شریعت ہے جو زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے اور حکومت کے ایوان سے لے کر عوامی زندگی تک کوئی مرحلہ ایسا نہیں جو اس سے باہر ہو اور جسے خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیس تئیس برس صلح و جنگ، حکومت و تجارت اور عائلی زندگی میں عملاً برت کر نہ دکھایا ہو۔

قرآن کریم نے بتایا ہے اللہ رب العزت جس طرح تکوین رب ہے اسی طرح تشریعی رب بھی ہے جیسے عالم تکوین میں اس کا حکم چلتا ہے ایسے ہی شریعت میں بھی اس کے حکم کو قطعیت حاصل ہے جس طرح نماز میں حق تعالیٰ کے حضور مسلمان کا سر نیاز جھکتا ہے اسی طرح پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایت کے آگے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے علیکم بالقرآن فاتخذوہ اماما

آپ کا ناچیز خادم

احقر عبید اللہ انور

۱۸ جنوری ۱۹۷۵ء



بشارتِ ولادت

ایک روز کا ذکر ہے کہ قبیلہ قریش کی ایک نیک سیرت اور روشن ضمیر خاتون امّ الفضل بنت حارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔ "یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے رات بڑا عجیب اور بھیانک خواب دیکھا ہے"۔ حضورؐ نے فرمایا۔ بیان کرو! خاتون نے عرض کیا۔ "میرے آقا وہ خواب اس قدر ڈراؤنا اور خطرناک ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی"۔ رحمت عالمؐ نے تسلّی دیتے ہوئے متبسّم ہو کر فرمایا۔ "کوئی مضائقہ نہیں، تم اپنا خواب ضرور بیان کرو۔ رحمتِ مجسّم کی شفقت کا دریا موجزن دیکھا تو خاتون گویا ہوئی۔ "میں نے دیکھا ہے کہ آپؐ کے جسد اطہر کا ایک ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں رکھ دیا گیا"۔ فخرِ موجوداتؐ نے سن کر فرمایا۔ اس میں اس قدر گھبراہٹ اور سراسیمگی کی کیا ضرورت تھی؟ یہ تو بڑا مبارک خواب ہے۔ اللہ تعالےٰ میری نورِ نظر فاطمہ رضؓ کو بیٹا عطا فرمائے گا جسے تم گود میں اٹھاؤ گی"۔ (مستدرک حاکم جلد سوم صفحہ ۱۷۶)

ولادت باسعادت

سرورِ کونینؐ کی زبان نبوت سے یہ تعبیر سن کر امّ الفضل زوجۂ عباسؓ، عمّ رسولؐ مسرور و مطمئن ہو کر چلی گئیں اور بات آئی گئی ہو گئی۔ زمانہ گزرتا گیا اور آفتاب طلوع و غروب ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ۴ھ کے شعبان کا چاند نمودار ہوا اور جب شعبان کی چار تاریخ آئی تو امّ الفضل کا خواب پورا ہو گیا اور مخبر صادقؐ کی بتائی ہوئی تعبیر کی صداقت آفتاب نصف النہار کی طرح ضیاء ریز ہو گئی۔ حضورؐ نومولود کی خبر پا کر سیدۃ النساء کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے اور ایک پُر مسرت آواز میں ارشاد فرمایا "میرے بیٹے، میرے جگر کے ٹکڑے کو میرے پاس لاؤ"۔

جگر گوشۂ رسولؐ کو ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر دستِ نبی میں دے دیا گیا۔ سید العرب والعجم نے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں تکبیر کہی۔ اور پھر نہایت پیار سے اپنی آغوشِ نبوّت میں لے لیا۔ اس کے بعد ہادیٔ کائناتؐ نے بنتِ رسولؐ کو حکم دیا۔ میرے لاڈلے کے بالوں کے ہموزن چاندی خیرات کرو اور عقیقہ دو۔ ارشادِ مرشدؐ کے ساتویں روز یہ سنّت ادا کر دی (مستدرک حاکم ج ۳ صفحہ ۱۷۹)

نام

ایک روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے سالارِ کربلا کا نام حضرت معاویہؓ بن ابو سفیان کے دادا کے نام پر "حرب" رکھا۔ لیکن سازِ چشم آفرینشؐ نے ہدایت فرمائی کہ میرے بیٹے کا نام "حسین" رکھا جائے۔ (اسد الغابہ ج ۲ صفحہ ۱۰)

پرورش

جب چشمِ رسولؐ کا نور (حسینؓ) ظاہر ہوا نگاہِ مصطفےٰؐ کا تارہ (حسنؓ) ابھی مدتِ رضاعت میں تھا۔ سید البشرؐ نے اپنی چچی ام الفضل سے ارشاد فرمایا۔ میرے بچے کو آپ دودھ پلایا کریں۔ اس طرح جنّت کے نوجوانوں کے سردارؓ نے فاطمہؓ بنت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دودھ پینے کے بجائے ام الفضل بنتِ حارث کا دودھ پیا۔ اور خاتم الانبیاءؐ کے جسم کا ٹکڑا ام الفضل بنتِ حارث کی گود میں چلا گیا۔ اور پھر ام الفضل کی حضرت حسینؓ سے اولاد سے بڑھی ہوئی محبت کے پیشِ نظر شافعِ محشرؐ نے ان کی پرورش بھی ام الفضل کے سپرد فرما دی۔

تعلیم و تربیت

یہ فخر حسنؓ و حسینؓ اور زیدؓ و علیؓ کے علاوہ اس روئے زمین پر کسی اور کو حاصل نہیں ہوا کہ ان نفوسِ قدسیہ کی اصلاح و تربیت خود معلمِ کائناتؐ نے فرمائی۔ لیکن ان اصحابِ اربعہ میں سے حضرت حسینؓ کو رہبرِ انسانیتؐ کے زیرِ دست رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ آپ ابھی بچے ہی تھے کہ سراجِ منیرؐ غروب ہو گیا لیکن آدابِ نماز آپ نے اسی عمر میں رہنمائے ہدایتؐ سے سیکھ لیے تھے۔

ابنِ نبیؐ کے ذہین نواسے نے اس کے علاوہ بھی بہت سے دینی اور فقہی مسائل ایامِ طفولیت ہی میں سمجھ لیے تھے۔ چنانچہ ابو حوراء حضرت حسینؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے آپ سے عرض کیا کہ اپنے جدِّ محترم کے متعلق کوئی واقعہ سنائیے! حضرت حسینؓ نے فرمایا — "ایک روز میں رسولِ مبشرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت کچھ کھجوریں آپؐ کے سامنے رکھی ہوئی تھیں ان میں سے ایک کھجور اٹھا کر میں نے اپنے منہ میں رکھ لی"۔ اور یکایک جمالِ نبوت اور جلالِ رسالت یکجا ہو گئے اور نذیر مرسلؐ نے مجھے تنبیہ و نصیحت کرتے ہوئے فرمایا "بیٹے! تمہیں معلوم نہیں کہ صدقہ تو ہم آلِ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حرام ہے"۔ پھر فرمایا "کہ البتہ ہدیہ جائز اور حلال ہے"۔ اس نصیحت کے ساتھ ہی آقائے دو جہاںؐ نے انگلی ڈال کر میرے منہ سے وہ کھجور نکال دی۔ یہ روایت "اصابہ" کی ہے اور امام بخاری نے بھی اسے نقل کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ زائد ہیں "کخ کخ" "پیغمبرؐ کے اہل بیت زکوٰۃ نہیں کھایا کرتے"۔ (بخاری ج ۲ ص ۱۲۹)

وصالِ رسولؐ کے بعد خیالِ فاطمۃ الزہراؓ تربیتِ حسینؓ کی آرائش و زیبائش میں محو ہو گیا۔ نیک مائیں اپنے بچوں کی تربیت کر کے ان کو قوم کے مقدر کا ستارہ بنا دیتی ہیں۔ چنانچہ حضرت فاطمہؓ بنتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آپ کی تربیت فرمائی۔ اور حضرت علیؓ نے آپ کو لکھنا پڑھنا، شہ سواری، شمشیر زنی، نیزہ بازی اور دوسرے فنون جنگ سکھائے۔ اس کے بعد مدینۃ النبی جو علوم و فنون کا مرکز تھا وہاں جیّد اصحابِ رسولؐ نیک و صالح اور روح پرور ماحول میں سرچشمہ علم و فضل سے کسبِ فیض کیا۔ یہاں تک کہ نبیرۂ رسولؐ سیرت و اخلاق کا معمار بن گیا اور میدانِ کربلا میں قصرِ شجاعت کی پہلی اینٹ رکھی اور پوری امت کو اس کی تعمیر میں مصروف کر کے خود اپنے محبوب ناناؐ کے پاس چلے گئے۔

حضرت حسینؓ رسول اللہؐ کی نظر میں

اس تاریخ ساز ہستی کو یومِ ولادت سے لے کر یومِ شہادت اور روزِ شہادت سے لے کر زمانۂ حال تک دنیا کی ہر زبان میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ عاشقانِ حسینؓ اور عقیدت مندانِ شہیدِ کربلا نے آپ کے علوئے درجات کے بیان میں ذرا بخل نہیں کیا۔ ادیبوں نے مقالے لکھے۔ شعراء نے قصیدے تصنیف کئے۔ خطیبوں نے نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ تاریخ و سیر لکھنے والوں نے تعریف و توصیف کی قوالوں نے "جوہر" دکھائے، ماتم داروں نے سینہ کوبی کی۔ "حزن و ملال" میں ڈوبے ہوئے ذاکروں نے اشک ریزی کی اور سچے عاشقوں نے کربلا کے غازی کی اتباع میں شب بیداری اور سحر خیزی کی یہ سب کچھ ایک طرف اور زبانِ وحی و نبوت کے چند موتی ایک طرف احادیثِ صحیحہ اور روایاتِ مصدقہ شہادت دیتی ہیں کہ محبوبِ یزداں اور محمودِ کون و مکاں نے جب بھی حضرت حسینؓ کا ذکر فرمایا۔ آپ کے متعلق ہمیشہ ایسا اسلوبِ بیان اختیار فرمایا۔ جس سے آپ کی بلندی اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک بار ارشاد ہوا:

حسین منی و انا من حسین احب اللہ من یحب الحسین حسین سبط من الاسباط (بخاری و ترمذی)

"حسینؓ مجھ سے ہے اور میں حسینؓ سے ہوں۔ اللہ تعالیٰ اسے محبوب رکھے جو حسینؓ کو محبوب رکھتا ہے حسینؓ گروہ اسباط میں سے ایک سبط ہے۔"

شفقتِ رسولؐ

خدا کے رسولؐ کی نظر میں جس ہستی کا مرتبہ اس قدر بلند ہو اس سے محبوبِ ربّ العالمین جتنی محبت فرماتے درست تھی چنانچہ امام الانبیاء اکثر و بیشتر نمازِ فجر ادا کرنے کے لیے تشریف لے جاتے ہوئے حضرت فاطمہؓ کے دولت کدے پر آواز دیتے کہ "السلام علیکم یا اہل بیت النبوۃ"۔ فرحت و انبساط اور شفقت و محبت

ہیں ڈوبی ہوئی یہ آواز سنتے ہی حضرت فاطمہؓ بنتِ رحمت کے دونوں نواسوں کو لے کر دروازے پر آجاتیں۔ اور حضورؐ دونوں کو پیار کر کے مسجد جاتے۔ معلم اخلاقؐ کے اس طریقِ پُرسش نے دونوں نونہالوں کو اس قدر کم سنی ہی میں سحرخیز بنا دیا تھا۔ (ترمذی)

محبتِ رسولؐ

محبت کا یہ حال تھا کہ راحتِ قلب ونظرؐ حضرت حسینؓ کو روتا ہوا دیکھ کر مغموم ہو جاتے تھے۔ ایک بار آپؐ حضرت عائشہ صدیقہؓ بنتِ صدیق اکبرؓ دلدادۂ رسولؐ کے گھر سے نکل کر کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ جب حضرت فاطمہؓ کے گھر کے قریب پہنچے تو حضرت حسینؓ کے رونے کی آواز آئی۔ آپؐ اسی وقت گھر کے اندر تشریف لے گئے اور فرمایا "فاطمہؓ! تمہیں معلوم نہیں کہ اس کے رونے سے میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور میں نے اپنے کانوں سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسینؓ کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور ان کے دونوں پیر رحمۃ للعالمینؐ کے دونوں پیروں پر تھے اور مقصودِ کائناتؐ فرما رہے تھے کہ "اے چھوٹے چھوٹے قدموں والے! آگے بڑھ، آگے بڑھ۔ حسینؓ اوپر چڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے پیر حضورؐ کے سینۂ پُرنور تک پہنچ گئے۔ پھر آپ نے حسینؓ کو بوسہ دے کر دعا کی کہ:

"اے اللہ! میں حسینؓ سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر"۔ (الاستیعاب ج ا صفحہ ۱۴۳)

حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں۔ میں ایک دن کسی ضرورت کے تحت دولت کدۂ رسولؐ پر حاضر ہوا۔ میری دستک پر جب آپؐ باہر تشریف لاتے کوئی چیز چادر میں لپیٹ کر اٹھائی ہوئی تھی۔ میں نے استفسار کیا تو آپؐ نے چادر کھول دی جس میں حسنینؓ کو لپیٹ رکھا تھا۔ پھر آپؐ نے فرمایا یہ دونوں میرے اور میری بیٹیؓ کے بیٹے ہیں۔ اے اللہ! میں انہیں محبوب رکھتا ہوں تو بھی انہیں محبوب رکھ۔ اور انہیں بھی جو انہیں محبوب رکھیں۔ (ترمذی)

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اتنے میں حسنؓ و حسینؓ آگئے وہ دونوں اس وقت سرخ قمیضیں پہنے ہوئے تھے اور چلنے میں لڑکھڑا رہے تھے۔ انہیں لڑکھڑاتے ہوئے دیکھ کر سیّد الوارثینؐ نے خطبہ ملتوی فرما دیا۔ اور منبر سے اتر کر ان دونوں کو اٹھا لیا۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے آزمائش ہے۔ میں نے ان بچوں کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا یہاں تک کہ میں نے خطبہ ملتوی کر کے انہیں اٹھا لیا۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک)

حضرت انس بن مالک کا بیان ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپؐ کو اہل بیت میں سب سے پیارا کون ہے؟ صادق الوعدؐ نے فرمایا، حسن و حسین۔ (رضی اللہ عنہما) (ترمذی)

افضل الانبیاءؐ کے ایام علالت میں ایک روز حضرت فاطمہؓ حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) کو لے کر دربارِ نبوت میں حاضر ہوئیں۔ یہ آپؐ کی زندگی کے آخری ایام تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ! یہ دونوں آپؐ کے فرزند ہیں انہیں اپنی وراثت میں سے کچھ عطا فرمایئے!"۔ آپؐ نے فرمایا۔ حسنؓ کو میں نے اپنی ہیبت اور سرداری عطا کی اور حسینؓ کو شجاعت و سخاوت" (تہذیب التہذیب ج ۲ صفحہ ۳۴۵)

حضرت حسینؓ اور صدیق اکبرؓ

وصالِ رسولؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بنے تو اس وقت حضرت حسینؓ کی عمر تقریباً سات سال تھی۔ اس لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں حضرت حسینؓ کا کوئی قابل ذکر واقعہ سامنے نہیں آتا سوائے اس کے کہ خلیفۃ المسلمین حضرت صدیق اکبرؓ نبیرۂ رسولؐ حضرت حسینؓ کو جب کبھی راستے سے گزرتے ہوئے دیکھتے تو فوراً بلا لیتے اور پیار کرتے۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً خود بھی بلا کر شفقت و ہمدردی کا اظہار فرماتے۔

حضرت حسینؓ اور فاروقِ اعظمؓ

خلیفۂ اوّل کی وفات کے بعد حضرت عمر فاروق اعظمؓ خلیفہ ہوئے۔ آپ کے دورِ خلافت کے آخری ایام میں حضرت حسینؓ سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔ اوراقِ تاریخ پر پھیلے واقعات شہادت دیتے ہیں کہ حضرت عمرؓ زندگی

آخری لمحہ تک آپؓ کے حال پر نہایت مہربان رہے اور ان کی محبت و دستگیری میں کبھی کمی نہ کی۔ ان کی ہمیشہ خواہش رہتی تھی کہ حضرت حسینؓ سے زیادہ سے زیادہ ملاقات کا موقع ملے۔ چنانچہ خلیفہ دوم نے اپنی اس خواہش کا ایک بار حضرت حسینؓ کے سامنے بھی اظہار کیا اس کے چند روز بعد حضرت حسینؓ محبِّ اولادِ رسولؐ سیدنا فاروق اعظمؓ سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ حضرت عمرؓ کے دروازے پر ان کے صاحبزادے کھڑے تھے۔ حضرت حسینؓ بھی ان کے ساتھ کھڑے ہوکر دوستانہ گفتگو میں مصروف ہوگئے۔ اس وقت حضرت امیر معاویہؓ اور فاروق اعظمؓ کسی اہم مسئلہ پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ جب ابن عمرؓ واپس گئے تو حضرت حسینؓ بھی واپس آ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد جب دوبارہ حضرت عمرؓ اور حضرت حسینؓ کی ملاقات ہوئی تو حضرت عمرؓ نے حضرت حسینؓ سے نہ ملنے کا شکوہ کیا۔ حضرت حسینؓ نے فرمایا۔ میں تو خود آپ کی زیارت و ملاقات کا مشتاق رہتا ہوں اور میں آیا تھا آپ کسی مسئلے پر حضرت امیر معاویہؓ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ اس لیے میں ابن عمرؓ کے ساتھ کچھ دیر کھڑا باتیں کرتا رہا۔ اور پھر واپس چلا گیا۔" یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ آپ کو ابن عمرؓ کے ساتھ دروازے پر کھڑے ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ اُن سے زیادہ حقدار ہیں۔ ہمیں جو عزت حاصل ہے وہ خدا تعالےٰ کے بعد آپ لوگوں کی دی ہوئی ہے۔ (اصابہ فی تمیز الصحابہ ج ۲ ص ۱۵)

حضرت عمرؓ اور حبِّ اہل بیتؓ

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں اللہ تعالےٰ کے فضل سے مدائن فتح ہوا اور مالِ غنیمت مسجد نبویؐ میں لا کر پھیلایا گیا تو حضرت عمرؓ نے اسے تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ سب سے پہلے حضرت حسنؓ تشریف لائے تو حضرت عمرؓ نے ایک ہزار درہم عطا فرمائے۔ ان کے بعد حضرت حسینؓ تشریف لائے تو ان کو بھی ایک ہزار درہم دیے گئے۔ تیسرے نمبر پر عبداللہ بن عمرؓ آئے تو ان کو صرف پانچ سو درہم دیے گئے۔ اس پر انہوں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا اے امیرالمومنین! میں ایک طاقتور آدمی ہوں اور جس وقت حسنؓ و حسینؓ مدینہ کے بازار میں کھیلا کرتے تھے میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جہاد میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن آپ نے ان کو ایک ایک ہزار اور مجھے کل پانچ سو درہم عنایت فرمائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے عبداللہ! یہاں سے چلے جاؤ۔ پہلے ان کے باپ جیسا باپ، ان کی ماں جیسی ماں، ان کے نانا جیسا نانا، ان کی نانی جیسی نانی، ان کے چچا جیسا چچا، ان کی پھوپھی جیسی پھوپھی، ان کے ماموں جیسا ماموں اور ان کی خالہ جیسی خالہ تو لاؤ۔ سنو! خدا کی قسم، ان کے باپ علی المرتضیٰؓ ہیں، ان کی ماں فاطمۃ الزہراؓ ہیں، ان کے نانا حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ان کی نانی خدیجۃ الکبریٰ ہیں، ان کے چچا جعفر طیار ہیں، ان کی پھوپھی امّ ہانی بنت ابی طالب ہیں، ان کی خالہ حضرت رقیہؓ اور حضرت امّ کلثومؓ ہیں اور ان کے ماموں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فرزند حضرت ابراہیم ہیں۔

ایک بار یمن سے کچھ حلّے مدینہ آئے اور حضرت عمرؓ نے وہ حلّے صحابہؓ میں تقسیم فرمائے۔ جب آپ تقسیم فرما چکے تو اچانک حضرات حسنؓ و حسینؓ بھی آ پہنچے۔ جب آپ کی نظر ان دونوں صاحبزادوں پر پڑی تو آپ بے قرار ہوگئے اور لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ تم لوگوں کو یہ حلّے دے کر مجھے مسرت کے بجائے رنج ہوا ہے۔ حاضرین نے سبب پوچھا۔ تو آپ نے فرمایا کہ جب تک ان سے بہتر حلّے حسنؓ و حسینؓ کے جسم پر سجے ہوئے نہ دیکھ لوں مجھے آرام نہیں آئے گا۔ چنانچہ آپ نے اسی وقت یمن کے حاکم کے نام فرمان جاری کیا کہ فوری طور پر دو حلّے اور بھیجو اور جب وہ آ گئے تو حسنینؓ کو پہنا دیے۔ تو آپ نے فرمایا۔ اب مجھے حقیقی مسرت حاصل ہوئی۔ (ابن عساکر ج ۴ ص ۳۲۱)

حضرت عمرؓ کے حکم سے جب مسلمانوں کے لیے بیت المال سے وظائف مقرر کیے گئے تو غزوۂ بدر میں حصہ لینے والے صحابہؓ کے فرزندوں کے لیے دو ہزار

خلیفہ مقرر ہوا تو اس موقع پر بھی حضرت عمرؓ نے حسنینؓ کے ساتھ امتیازی سلوک کیا۔ اور صرف اس لیے کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے تھے۔ ان دونوں حضرات کے لیے پانچ پانچ ہزار درہم مقرر فرمایا۔ (فتوح البلدان)

ان چند واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ اہل بیتِ رسولؐ سے کس قدر محبت فرماتے تھے اور حضرت حسینؓ کا درجہ آپ کی نظر میں کتنا بلند تھا اور حضرات حسنینؓ کے حضرت عمرؓ کے ساتھ تعلقات کتنے گہرے تھے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد جب حضرت عثمانؓ خلیفہ بنے تو آپ کے عہدِ خلافت میں حضرت حسینؓ جوان ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد عثمانی میں آپ میدان کارزار میں نظر آتے ہیں۔ ۳۰ھ میں جب طبرستان پر حملہ کیا گیا تو حضرت حسینؓ نے اس جنگ میں رضاکارانہ طور پر شریک ہو کر جوہر دکھائے۔ (ابن اثیر ج ۳ ص۸۴)

۳۵ھ میں جب باغیوں اور مفسدوں نے حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کیا اور حضرت عثمانؓ کی جان خطرے میں پڑ گئی تو اس نازک وقت میں حضرت حسینؓ نے دوسرے نوجوانوں کے ہمراہ بیت عثمانؓ پر حفاظتی پہرہ دیا اور یورش کرنے والے مفسدین کو بڑی جرأت اور بہادری کے ساتھ روکتے رہے۔ اس موقع پر محافظین عثمانؓ اور باغی گروہ کے درمیان جنگ ہوئی تو حضرت حسینؓ نے نہایت سرگرمی سے حصّہ لیا۔ اور جب دشمن بچ بچا کر عقبی جانب سے حضرت عثمانؓ کے مکان میں داخل ہو کر ان کو شہید کرنے کی مذموم حرکت کر گئے تو حضرت علیؓ نے حضرت حسینؓ کو ڈانٹا اور تھپڑ مارا کہ تم جیسے بہادر کی موجودگی میں خلیفۃ المسلمین کیسے شہید ہو گئے؟ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں حضرت حسینؓ کی کوتاہی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اور یہ آپ کی جاں نثاری اور بہادری ہی تھی کہ جس کی بدولت مفسدین مکان کے دروازے سے داخل ہونے میں ناکام رہے۔

شجاعت و بہادری

الغرض شجاعت و مردانگی میں بھی آپ یکتائے روزگار

ایک طرف عرب مؤرخ عمر ابوالنصر آپ کی شجاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایک بار میدان جنگ میں حضرت حسینؓ نے دشمن کو ان الفاظ میں چیلنج دیا۔ "کون ہے جو میرے مقابلہ میں آتا ہے؟"

یہ چیلنج سن کر ایک بہت نامی گرامی بہادر زبرقان مقابلہ میں آیا اور پوچھا "تم کون ہو؟"

فقال: انا الحسین بن علی فقال الزبرقان انصرف یا بنی فانی واللہ لقد نظرت الی رسول اللہ مقبلاً من ناحیۃ قباء علی ناقۃ حمراء وانت یومئذٍ قدامہ لما کنت لالقیَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدمک۔ (الحسین ص۴۱)

آپ نے فرمایا میں حسین بن علیؓ ہوں (اس پر) زبرقان نے کہا۔ اے میرے بیٹے! تم میدان سے ہٹ جاؤ (کیونکہ) ایک روز میں نے دیکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار ہو کر قباء کی طرف جا رہے تھے اور تم حضورؐ کے آگے بیٹھے تھے۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حالت میں ملاقات کرنا پسند نہیں کرتا کہ میرے ہاتھ تمہارے خون سے رنگین ہوں۔

حضرت حسینؓ اور حضرت معاویہؓ

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ نے بعض شرائط پر حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تھا اور حضرت معاویہؓ دونوں بھائیوں کا ایک سا خیال فرماتے تھے اگرچہ حضرت حسینؓ حضرت حسنؓ کے اقدام دستبرداری سے خوش نہ تھے۔ تاہم اس کے باوجود حضرت معاویہؓ حضرت حسینؓ کے متعلق ہمیشہ اچھے کلمات استعمال کیا کرتے تھے۔ اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں صاحبزادوں کے ساتھ اصحاب ثلاثہ خلفاء راشدین کی طرح نیک سلوک کیا اور اسی طرح مراعات دینے میں امتیازی حیثیت برقرار رکھی۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے لیے دس دس لاکھ دینار سالانہ مقرر فرمائے تھے۔ اس کے علاوہ مواقع پر تحائف، نذرانہ، ہدایہ وغیرہ الگ تھے۔

حضرت معاویہؓ کے دورِ حکومت میں غیر ممالک میں جو مہمات بھیجی گئیں ان میں سے ایک مہم میں حضرت حسینؓ نے بھی حصہ لیا۔ یہ ۴۹ھ کی قسطنطنیہ کی مہم تھی جس کے کمانڈر انچیف یزید بن ابوسفیان برادر معاویہؓ تھے۔ بعض مورخین نے یزید بن معاویہؓ کا نام لیا ہے۔ لیکن ابن کثیر نے اس کی نفی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس لشکر کے سالار یزید بن فضالہ بن عبید تھے۔ (ابن کثیر ج ۸ صفحہ ۳۲)

بعض لوگوں نے اس کمانڈر کا نام سفیان بن عوف بھی لکھا ہے۔ بہرحال یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ سالار اموی تھا جس کی قیادت میں حضرت حسینؓ نے دشمنوں سے جہاد کیا۔ عیسائی مؤرخ گبن نے قسطنطنیہ کی مہم میں آپ کی شرکت اور شجاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "حسنؓ کے برادر خورد حسینؓ نے اپنے باپ کی شجاعت و بسالت سے بطور ورثہ حصہ پایا تھا۔ چنانچہ قسطنطنیہ میں عیسائیوں کے خلاف جو جنگ ہوئی اس میں حسینؓ نے امتیازی کارنامے انجام دیئے۔" (زوال روما، گبن ص ۲۹۲)

اخلاق و عادات

یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فیض صحبت کا اثر تھا کہ آپ بچپن ہی سے خوش خلق، خندہ رو اور شائستہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ بسیار گوئی کے عادی نہ تھے۔ ان خصوصیات کی بناء پر لوگوں میں بے حد مقبول تھے۔ چنانچہ ایک بار حضرت معاویہؓ نے ایک انجان شخص حضرت حسینؓ کی خدمت میں بھیجا اور اس کو حضرت حسینؓ کی یہ شناخت بتائی "جب تم مدینہ میں پہنچ کر مسجد نبویؐ میں داخل ہوگے تو وہاں تمہیں لوگوں کا ایک حلقہ نظر آئے گا۔ اس حلقہ میں لوگ اس قدر خاموشی اور وقار کے ساتھ بیٹھے ہوں گے جیسے ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہیں۔ بس تم سمجھ لینا کہ یہ حسینؓ کا حلقہ ہے۔"

عجز و انکسار ایک طرف تو سنجیدگی اور وقار کا یہ عالم تھا لیکن دوسری جانب طبیعت میں انکساری و عاجزی بھی اس قدر تھی کہ ہر کس و ناکس مسلمان کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے سے کوئی دریغ نہیں فرماتے تھے۔ ایک بار سرِ راہ چند غرباء نے کھانے پر بلایا آپ بلا جھجک ان کے ساتھ جا بیٹھے اور پھر شام کو ان غرباء کو اپنے دسترخوان پر مدعو کرکے انواع و اقسام کے کھانے کھلائے۔

(ابن عساکر ج ۴ ص ۳۲۲)

وسعتِ ظرفی شجاعت، بہادری، انکساری کے ساتھ ساتھ آپ انتہائی وسیع الظرف بھی تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ آپ کھانا کھا رہے تھے اور آپ کی ایک کنیز پانی کا پیالہ لئے قریب کھڑی تھی کہ ایک جھٹکے سے پیالہ اس کے ہاتھ سے گرا اور ٹوٹ گیا۔ آپ کے کپڑے پانی سے لت پت ہو گئے۔ اس کوتاہی پر فطری بات ہے کہ غصہ آنا تھا چنانچہ آپ نے ذرا خشمگیں نظروں سے دیکھا تو کنیز نے فوراً کہا۔ والکاظمین الغیظ (متقی لوگ غصہ پی لیتے ہیں) آپ نے فرمایا۔ کظلمت غیضی۔ (میں نے اپنا غصہ پی لیا) ذہین کنیز پھر بولی۔ والعافین عن الناس (وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں) آپ نے فرمایا عفوت عنک (میں نے تجھے دل سے معاف کر دیا) کنیز نے کہا۔ واللہ یحب المحسنین (اللہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے) آپ نے فرمایا "جا میں نے تجھے آزاد کر دیا" (احوال آئمہ اثنا عشری، شیخ عبدالحق محدث دہلوی)

بعض لوگوں نے اس واقعہ کو کنیز کی بجائے غلام کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔

سخاوت و فیاضی ایک بار ایک دیہاتی سائل مدینہ آیا اور لوگوں سے اس نے پوچھا۔ کہ یہاں سب سے زیادہ سخی کون ہے؟ لوگوں نے حضرت حسینؓ کا نام بتایا۔ چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کی شان میں تین شعر پڑھے۔ حضرت حسینؓ نے اپنے غلام سے کہا جو رقم موجود ہو وہ لا کر اسے دے دو کیونکہ یہ شخص ہم سے زیادہ ضرورت مند ہے۔ اور پھر سائل کے اشعار کے جواب میں آپ نے بھی تین شعر پڑھے "میں تمہیں تھوڑی سی رقم دے رہا ہوں جس کے لیے تم سے معذرت خواہ ہوں۔ مگر تم یقین کرو کہ اگر وسائل محدود نہ ہوتے تو تم دیکھتے کہ میرے جود و سخا کا مینہ کس طرح برستا ہے۔" سائل یہ سن کر رونے لگا۔ آپ نے فرمایا۔ "شاید تم اس لیے رونے ہو کہ میں نے تمہیں بہت کم

رقم دی ہے۔" سائل نے جواب دیا "میرے رونے کی یہ وجہ نہیں، میں تو اس لیے روتا ہوں کہ ایسے سخی اور نیک لوگوں کو زمین کس طرح کھا جائے گی؟"

(ابن عساکر ج ۴ ص ۳۲۵)

عبادت و ریاضت

ان گوناگوں صفات کی حامل یہ ہستی عبادت و ریاضت میں بھی ایک مثالی ہستی تھی۔ چنانچہ آپ کے دن رات درس و تدریس میں گزرتے تھے اور نماز کے وضو کی تجدید فرماتے اور رکوع و سجود کی حالت میں پوری پوری رات گزر جاتی۔ اور چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ جب لوگوں نے اس کیفیت کے متعلق دریافت کیا تو آپؓ نے فرمایا۔ لیامن من یوم القیامۃ الذی خاف اللہ فی الدنیا۔ "یعنی جو شخص دنیا میں خدا سے ڈرتا ہے وہ قیامت کے روز مامون رہتا ہے۔"

(شہید الاسلام ص ۹۶)

علم و فضل

"استیعاب" و "اسد الغابہ" نے لکھا ہے کہ علمائے تاریخ و سیر حضرت حسینؓ کے علم و فضل کے بارے میں متفق الرائے ہیں۔ اور بڑے بڑے صحابہؓ بھی بعض مسائل میں آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ جو خود ایک بلند پایہ عالم اور فقیہہ تھے اسیر کی رہائی کے سلسلے میں مسئلہ دریافت کرنے کے لیے آپ کے پاس گئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے پوچھا "قیدی کی رہائی کا ذمہ دار کون ہے؟" آپ نے فرمایا کہ "جن لوگوں کی حمایت میں لڑتے ہوئے وہ گرفتار ہوا ان کا فرض ہے کہ وہ اسے آزاد کرائیں۔"

اسی طرح عبداللہ ابن زبیرؓ ہی کے استفسار کے جواب میں آپ نے بچہ کے وظیفے کے بارے میں یہ فتوے دیا کہ "لبطنِ مادر سے نکلنے کے بعد جب بچہ آواز دے اس وقت سے وہ وظیفہ کا مستحق ہو جاتا ہے۔"

تعلیمات و ارشادات

افسوس کہ عقیدت مندانِ حسینؓ نے حضرت حسینؓ کی زندگی کے اس پہلو کو نظر انداز کیا ہوا ہے ان کے بیانوں میں شجاعت و بہادری کے واقعات ملتے ہیں لیکن یہ نہیں بیان کیا جاتا کہ حضرت حسینؓ ایک بہت بڑے معلمِ اخلاق بھی تھے۔ ایک طرف تو آپ میدانِ کارزار میں تلواروں کے سائے میں یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ جب حق و باطل میں ٹکراؤ اور مقابلے کا مرحلہ درپیش ہو تو حق کی حمایت و مدافعت اور باطل کی ہزیمت و سرکوبی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور اپنے مال و اسباب کے علاوہ اس پر اپنی اولاد بھی قربان کر دو۔ مگر باطل کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرو۔ لیکن دوسری طرف آپ کی یہ حالت ہے کہ جب گوشۂ عافیت میں بیٹھتے ہیں تو اسلامی معاشرے کی فلاح و بہبود کے طریق کار پر غور کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے بلند پایہ خطبات کی چیز ہیں۔

شعر و شاعری

حضرت حسینؓ نے شاعری کو فن کی حیثیت سے کبھی اختیار نہیں فرمایا۔ اور نہ کبھی اپنے کلام کو جمع کرنے کا التزام کیا لیکن فطرت کی طرف سے طبع موزوں، عقل سلیم اور ذہن رسا لے کر آئے تھے اور شدتِ احساس کی دولت سے مالا مال تھے۔ اس لیے بسا اوقات حالات و واقعات اور قدرتی مناظر سے متاثر ہو کر آپ پر شاعرانہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اس حالت میں زبان پر بے ساختہ موزوں کلام جاری ہو جاتا تھا۔ اور یہ کلام انتہائی پاکیزہ اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بلند پایہ ہوتا تھا۔ بطور نمونہ یہاں صرف دو شعر نقل کیے جاتے ہیں ؎

اذا ما عضک الدھر فلا تجنح الی خلق
ولا تسل سوی اللہ تعالیٰ قاسم الرزاق

دنیا کی طرف سے جب تمہیں تکلیف پہنچائی جائے تو سوائے اللہ تعالیٰ کے جو روزی رساں ہے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرو۔

فلو طشت وطوفت من الغرب الی المشرق
لما صادفت من یقدر ان یسعد او یشقی

اگر تمہیں زندگی بھی مل جائے اور مشرق سے لے کر مغرب تک بھی ہو آؤ تب بھی تمہیں کوئی ایسا نہیں ملے گا جو خوش بخت یا بدبخت بنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

★

انجم استدلالی



تصویر کے دو رخ

اسلامی تاریخ کا نیا سال محرم الحرام سے شروع ہوتا ہے اور جب محرم آتا ہے تو اس عظیم تاریخی حادثہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو اس مہینہ کے پہلے عشرہ کی آغوش میں ہے۔

اس حادثہ کا نام حادثہ کربلا ہے۔ جس میں سیدنا حضرت حسینؓ نے اپنے ۷۲ جانثاروں سمیت جام شہادت نوش فرمایا۔ ان کی شہادت کا پس منظر ایک الگ موضوع ہے اور یہ ایک الگ عنوان ہے کہ قتل حسینؓ کا ذمہ دار یزید ہے۔ یا اس کے وزرا؟

یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ شہادت حسینؓ کے اصل ذمہ دار ابن زیاد اور شمر ذوالجوشن ہیں۔ لیکن کچھ سوز خوانوں نے بعض افسانہ نویس مؤرخین کی روایات کا سہارا لے کر اس کا ذمہ دار یزید کو بھی ٹھہرایا ہے پھر اسی پر بس نہیں کی بلکہ شوخیٔ طبع کا مظاہرہ کرتے ہوئے کاتب وحی امیر المؤمنین سیدنا معاویہؓ کو بھی نشانہ ہدف بنایا ہے۔

جہاں تک حضرت معاویہؓ کا تعلق ہے تو ان کی عظمت شان کو دیکھتے ہوئے حضرت حسنؓ ان کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے اگر وہ حضرت معاویہؓ کو اس منصب کا اہل نہ سمجھتے تو برادر خورد حضرت حسینؓ کی طرح جان دے دیتے لیکن اپنے موقف کو قطعاً نہ چھوڑتے۔ ان کا خلافت سے دستبردار ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک حضرت معاویہؓ نہایت موزوں شخصیت تھے۔

بعض روافضہ کو چھوڑ کر ملت اسلامیہ کے کسی بھی قابل ذکر مؤرخ نے حضرت معاویہؓ کی زندگی کے کسی پہلو پر جرح نہیں کی اور عہد معاویہؓ سے لے کر دور حاضرہ تک جس شخص نے بھی حضرت معاویہؓ پر جارحانہ قلم اٹھایا ہے اس کے پیچھے ہمیشہ سبائی تحریک کارفرما رہی ہے۔

جہاں تک ان کے جانشین یزید بن معاویہؓ کا تعلق ہے تو اس کے متعلق بے شک مؤرخین کی دو آراء ہیں اور اس طرح یزید کی تصویر کے دو رخ ہیں۔

ہم یہاں یزید کی تصویر کے دو رخ اس لیے پیش کرتے ہیں کہ محرم کی آمد کے ساتھ ذکر حسینؓ ایک فریضہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور ذکر حسینؓ کے ساتھ سب یزید کو بھی وجوبیت کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم یزید کی تصویر کے دو رخ پیش کر کے یہ فیصلہ خود کرنے کی بجائے اہل علم پر چھوڑ دیتے ہیں کہ یزید کیا تھا؟

تصویر کا ایک رخ

تو یہ ہے کہ یزید بدشکل اور بدمزاج تھا۔ حکومت کے کاموں میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ اس کا زیادہ وقت کتوں کی دیکھ بھال، سیر و تفریح اور شکار میں گزرتا تھا۔ یزید عورتوں کی محبت کا دلدادہ اور عیش و عشرت کا رسیا تھا۔ کثرت شراب نوشی نے اسے سست و بے خود بنا دیا تھا۔ اور اس کے ہوش و حواس بھی درست نہ تھے۔ پست کردار، بد چلن تند خو اور باپ کا نافرمان تھا۔ ان باتوں کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ اکثر و بیشتر واعظین کی تقاریر کا موضوع بنی رہتی ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ

ایک یہ بھی ہے کہ یزید کی تربیت ایک مدبر پاکباز صحابی کاتب وحی حضرت معاویہؓ اور نیک سیرت خاتون حضرت معاویہؓ کی اہلیہ نے کی تھی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ یزید کی ماں میسون بنت بحدل بڑی دیندار، پارسا، صاحب عقل و فکر اور عابدہ عورت تھی۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی شہرہ آفاق تاریخ میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن حضرت معاویہؓ کے ساتھ ایک زنخا خادم گھر آیا تو میسون نے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے پوچھا یہ کون ہے؟ حضرت معاویہؓ نے ان کے کان میں کہا کہ یہ زنخا ہے اس لیے اس سے پردہ کی کیا ضرورت ہے؟ میسون نے جواباً کہا کہ اس کے زنخا ہونے کی وجہ سے حرام حلال نہیں ہو سکتا۔

حضرت معاویہؓ کی پہلی بیوی کے دو لڑکے عبدالرحمٰن اور عبداللہ پیدا ہوئے تھے۔ عبدالرحمان فوت ہو گئے اور عبداللہ فاتر العقل تھے۔ چنانچہ آپ نے اولاد کی خواہش کے تحت دوسری شادی کی

تو یزید پیدا ہوا۔ حضرت معاویہؓ نے یزید کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ دینیات سے واقف کرانے اور قرآن کریم حفظ کرانے کے لیے اتالیق مقرر کیے۔ فن قرأت سے ابتدائی عمر ہی میں روشناس کرا دیا گیا۔ قرآن مجید کا بڑا حصہ حفظ کرنے کے بعد یزید خطبہ جمعہ اور خطبات عیدین دینے میں ماہر ہو گیا۔ اس کی خطابت میں فصاحت و بلاغت موزوں اشعار علمی اور ادبی نکات بکثرت ہوتے تھے۔ علم الانساب میں خاص مہارت تھی۔ تعلیم و تربیت پر حجر بن عنظلہؓ شیبانی مامور تھے۔ جو بہت بڑے صاحب علم بزرگ اور صحابی تھے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ وہ امام احمد بن حنبل کے چچا تھے اور "دغفل النسابہ" کے نام سے مشہور تھے۔

آپ کی رہائش بصرہ میں تھی لیکن حضرت معاویہؓ نے یزید کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے ہاں بلا کر رہائش پذیر کیا ہوا تھا۔ ۱۵ھ میں جب یزید کی عمر ۲۰ برس کی ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی حضرت عبدالمطلب بن ربیعہ بن الحارث ہاشمیؓ کے سپرد کر دیا گیا۔ انہوں نے اس کو علوم و فنون کا ماہر بنا دیا۔

حافظ ابن کثیرؒ اور علامہ ابن حزمؒ کا بیان ہے کہ یہ بزرگ یزید سے بیحد مانوس تھے اور یزید کی دینداری اور دوسری خوبیوں سے متاثر تھے۔ یہ دمشق سے مدینہ گئے تو یزید کی گوناگوں خوبیوں اور سیرت و کردار کی پختگی کی بنا پر یزید کو اپنا جانشین بنا کر گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت معاویہؓ وفات پا چکے تھے اور یزید اپنے والد کے جانشین اور مسلمانوں کے خلیفہ تھے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ یزید ایک مدبر سیاستدان زیرک رہنما اور ساحر خطیب تھا۔ ابن کثیرؒ نے اس کی فصاحت و بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے اس کے حسب ذیل جملہ بطور نمونہ پیش کیے ہیں۔ رحم اللہ ابا محمد اوسع لہ الرحمۃ واضعفاوا عظم اللہ اجرک واحسن عزاک وعوضک من مصابک ماھو خیر لک ثوابا وخیر عقبی۔

اس جلد میں ابن کثیرؒ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت سعید بن مسیبؒ نے ایک مرتبہ اچھے خطیبوں کا تذکرہ کیا تو پہلے معاویہؓ کا نام لیا پھر ان کے بیٹے یزید کا نام لیا۔ ایک نام انہوں نے عبداللہ ابن زبیر کا بھی لیا۔

الخطیب الاشدق

مؤرخین کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ یزید کو فن خطابت میں امتیاز حاصل تھا۔ اور عام طور پر لوگ یزید کو الخطیب الاشدق کے نام سے یاد کرتے تھے۔ نہج البلاغہ کے مشہور شارح ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ معاویہؓ کے بیٹے یزید خطیب اور شاعر تھے۔ صاحب عقد الفرید نے ان کے خطبات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

سپہ سالاری

حضرت معاویہؓ نے یزید میں جہاں علمی و ادبی صفات پیدا کرنے کی کوشش کی تو وہیں اس کو میدان جنگ کا ایک اچھا شہسوار بنانے پر بھی بھرپور توجہ دی اور اس کو بڑے بڑے معرکوں میں حصہ لینے کے قابل بنایا۔ ایک اچھے سپہ سالار اور ہشیار مرد میدان میں جو صفات ہونا ضروری ہیں وہ حضرت معاویہؓ کی کوشش و تربیت سے یزید میں بڑی حد تک پیدا ہو چکی تھیں۔

چنانچہ حضرت معاویہؓ نے رومیوں کی سرکوبی کے لیے بحری بیڑے کے ساتھ جو فوج روانہ کی اس کا سپہ سالار یزید تھا اور اس مہم میں ان کے ساتھ حضرت حسینؓ بھی شامل تھے۔ یہی وہ اسلامی جیش تھا جس نے رومیوں سے برسوں معرکہ آرائی کی۔

کتاب الجہاد بخاری کی جس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جیش کے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ قسطلانیؒ نے لکھا ہے کہ قسطنطنیہ پر پہلا جہاد امیر معاویہؓ کے بیٹے یزید نے کیا اور جو لوگ اس میں شامل تھے ان میں حضرت حسینؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی تھے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث سے یزید کی منقبت ثابت کی ہے۔

اس جہاد کے دوران بوڑھے صحابی حضرت ابو ایوب انصاریؓ انتقال فرما گئے تو یزید نے ان کی نماز جنازہ پڑھانے کے بعد حسب ذیل خطبہ دیا۔

"اے اہل قسطنطنیہ یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت بڑے صحابی کا جنازہ ہے۔ جن کو ہم نے یہاں سپرد خاک کیا ہے۔ واللہ اگر ان کی قبر کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا تو مملکت اسلامیہ کی ہر زمین سے اکھاڑ پھینکا جائے گا اور ارض عرب میں ناقوس کی آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی۔"

علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید نے دمشق کی جامع مسجد میں جو پہلی تقریر کی اس میں حضورؐ کے مشہور صحابی ضحاک بن قیس فہری گورنر دمشق بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ یزید کی تقریر سے اتنے متاثر ہوئے کہ پچھلی صف سے اٹھ کر ممبر کے قریب آ گئے۔ اس تقریر کا ترجمہ یہ ہے۔

(باقی صفحہ ۳۱ پر)



ہندوستان کی سرزمین پر جہاں ہر مذہب اور ہر ملت کے اہل دل ہمیشہ سے کثرت میں وحدت دیکھتے اور دکھاتے رہے ہیں، یہ بات کہنے کے لیے کسی دلیل اور بحث کی ضرورت نہیں ہے کہ حق کا نور ایک ہے مگر دیکھنے والے، ان میں جیسی اور جتنی دیدار کی طاقت ہے اس کا جلوہ اپنے اپنے رنگ میں دیکھتے ہیں اور اس کی کیفیت اپنی اپنی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ جب کوئی بات اس طرح کہنی ہو کہ ہر مذہب و ملت کے لوگ اسے سمجھ سکیں اور اس سے اپنے دل پر ٹھیک ٹھیک اثر لے سکیں تو ملتوں اور مذہبوں کی جدا جدا بولیوں اور الگ الگ مخصوص اصطلاحوں کو چھوڑ کر اسے انسانیت کی عام زبان میں کہنا ہوتا ہے۔ شہادت حسینؓ کے موضوع پر کچھ لکھنے اور لکھانے کا مقصد جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہی ہے کہ فخر انسانیت اور مایۂ نازش بشریت حسینؓ کے کارناموں کی قدر و قیمت کو انسانیت کے عام معیاروں پر پرکھا جائے اور اس کا نتیجہ انسانیت کی عام زبان میں بیان کیا جائے۔ سب جانتے ہیں کہ ایک محاورے کو دوسرے محاورے میں ترجمہ کرنا کٹھن کام ہے اور جب اس کے ساتھ یہ شرط ہو کہ ترجمے کی زبان وہ ہو جو انسانوں کے دل کی زبان ہے تو یہ کام اور بھی کٹھن ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے جو امام حسینؓ کا حال مذہبی رنگ میں سننے اور سنانے کا عادی ہے اسے اس نئے رنگ میں اس طرح بیان کرنا کہ اس ذکر سے جو کیفیت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہی دوسروں کے دل میں پیدا ہو جائے بہت مشکل ہے، مگر یہ بات ہمت بندھاتی ہے کہ جب سننے والوں کے دل ہمدردی اور محبت سے سمجھنے پر آمادہ ہوں تو وہ ادھ کہی بات بلکہ بن کہی بات بھی سمجھ لیتے ہیں۔

واقعہ شہادتؓ اور عالم انسانیتؓ

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عالم انسانیت کے لیے حسینؓ کی شہادت کیا تخت طلبی کی بس ایک ناکام کوشش ہے جس میں آپ کو ناکام فریق سے ایک تاریخی ہمدردی سی ہے؟ یا یہ محض ایک مغرور المزاج سردار کی ضد یا ناعاقبت اندیشی ہے، جس میں ضد کرنے والا اتفاق سے آپ کے محبوبؐ اور مخدوم آقاؐ کا جگر گوشہ ہے اس لیے آپ اس کی توجیہ کرتے ہیں۔ کیا یہ بے دردی اور سفاکی سے ایک کمزور جماعت کے مٹانے کی دل ہلانے والی کہانی ہے جس کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور آنسوؤں کی چند بوندیں آنکھوں سے بے اختیار ٹپک جاتی ہیں؟ دنیا کی تاریخ میں ہمدردیوں اور طرفداریوں کے لیے اتنے اور مواقع ہیں اور وہ شخصی اور جماعتی ناکامیوں اور نامرادیوں، بیدردیوں اور سفاکیوں کی کہانیوں سے اتنی پُر ہے کہ صرف ان کے لیے تو دنیا کو حسینؓ کی داستان کی خاص ضرورت نہیں، لیکن نہیں، حسینؓ کی کہانی ان میں سے کوئی چیز نہیں، وہ تو انسانی سرفرازی اور سربلندی کی داستان ہے، شرف انسانیت کی کہانی ہے، انسان کے پستی سے بلندی کی طرف ارتقاء کی روداد ہے اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معیاروں کی تفسیر ہے، یہی غلامی سے انسانی حریت کی طرف سفر کی منزل ہے، وہ دنیا میں خدائی بادشاہت کا اعلان ہے اور انسانوں میں اس کے قیام کے امکان بلکہ لزوم پر کسی جرح سے نہ ٹوٹنے والی شہادت ہے، وہ منزل تکمیل انسانی کی راہ کا چراغ ہے اس چراغ کو باطل کی قوتیں جب کبھی اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتی ہیں تو حسینؓ کی یاد اس کی لَو کو روشن کر دیتی ہے۔ جب راہ حق و حریت میں انسانیت کے قدم ڈگمگاتے ہیں تو حسینؓ کی مثال اسے سہارا دیتی ہے اور

سنبھال لیتی ہے۔ جب دولت وقوت واقتدار کی فرعونیت حق پرستوں کی تہی دست اور بے وسیلہ جمعیتوں پر عرصۂ زندگی تنگ کرتی ہے اور جب پیہم ناکامیوں کا ہجوم حق پر باطل ہونے کا وسوسہ دل میں ڈالتا ہے تو حسین ہی کی مثال انھیں ثباتِ قدم کا سبق دیتی ہے اور یاس کی کفر آفرینی سے بچاتی ہے۔ جب جماعتی زندگی کا فساد فرد کو بے حقیقت سا بنا دیتا ہے تو حسین کی مثال اس فرد کو اس کی ذمہ داری یاد دلاتی ہے کہ جماعت کو اخلاقی جماعت بنانے کا فرض آخری طور پر اسی پر عائد ہوتا ہے۔ چاہے اس کوشش میں جماعت اسے زہر کا پیالہ پلائے یا سولی پر چڑھائے، سنگسار کرے یا سر تن سے جدا کرے شہادت کے خون سے زمین کو لالہ زار بنائے۔ زندگی کے حریص انسانوں کو حسینؓ یاد دلاتے ہیں کہ زندگی ہر حال میں جیسے جانے کا نام نہیں ہے۔ اور جتلاتے ہیں کہ ع " ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی"۔ جب کامیابی کے طلائی بچھڑے کی پرستش ہر سو ہو رہی ہو تو حسینؓ ناکام کا نام ہی اس سحر سامری کا توڑ بن جاتا ہے اور حسینؓ کی ناکامی کے روبرو باطل کی ساری فتحمندیاں سرنگوں و شرمسار نظر آتی ہیں۔

حسینی عظمت کا راز

لیکن آخر یہ سب کیوں؟ اس لیے کہ حسین نے اپنی جان دے کر خدا کی خدائی اور انسان کی شرافت پر شہادت دی ہے اور اس دستاویز پر اپنے خون سے مہر ثبت کی ہے۔ یہ انسانی شرافت کیا ہے؟ یہ عالم پر انسان کو کونسی چیز برتری کا مرتبہ دیتی ہے؟ اس کے سینے میں قانون و اخلاق کا وجدان " یہ جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں"؟ اس کے دل میں اعلیٰ اقدار کا ذوق شوق، ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف جانے کا فطری قصد، اعلیٰ کو جان کر ادنیٰ پر قناعت سے اس کی فطری بیزاری، پھر ان اقدار اعلیٰ کا مطلق اور کامل حیثیت میں یقین اور اس پر اس کے قلب وضمیر کی تصدیق، یہی صفات اخلاقی کے وہ مکمل نمونے ہیں جن پر ہر چیز کی قدر و قیمت پرکھی جاتی ہے، مثلاً عدل، حق، خیر، حسن۔ انھیں سے اس کی شب تارِ حیات میں روشنی کی جھلک ہے۔ انہی سے اس کی بے چینی میں سکون اور پراگندگی میں دلجمعی کا سامان ہے، وہ بھٹکتا ہے تو یہی دلیل راہ ہوتی ہیں، زندگی کے دوراہے پر جب یہ کفر کی طرف جاتا ہے تو یہی اسے شکر کی طرف کھینچتی ہیں، "اسفل السافلین" میں بھی "احسن تقویم" یاد دلاتی ہے۔ انھیں بھلایا جاتا ہے مگر یہ پھر بار بار یاد آتی ہے، انھیں دبایا جاتا ہے مگر یہ پھر ابھرتی ہیں۔ ان سے بدکنے والے وحشی بھی "پھر پھر کے ان کو جاتے ہیں تکتے"۔ یہ اقدار مطلقہ حواس ظاہری سے محسوس نہیں ہو سکتیں ان کا تصور کیا جا سکتا ہے، چشم ظاہر ان کے نظارے سے محروم ہے، صرف چشم باطن ہی کو ان کی جھلک نظر آتی ہے، ہر ملک میں ایسے خدا کے بندے پیدا ہوتے ہیں جو ان اقدار کو بے حجاب اس طرح دیکھتے ہیں جیسے ہم چاند، سورج، ستاروں کو دیکھتے ہیں اور ان کے نور سے وہ دنیا کی ہر چیز کو، زندگی کے ہر شعبے کو، انفرادی ہو کہ اجتماعی، منور کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے قول سے ان اعلیٰ قدروں کی تلقین کرتے ہیں، اپنے عمل سے ان کی تصدیق کرتے ہیں، انھیں اپنے پر طاری کرتے ہیں اپنے اندر رچاتے ہیں اور اس طرح اپنی زندگی کی روشنی سے دوسروں کی نظریں ان تک پہنچاتے ہیں اور دوسرے بھی ان کی طرف جھکاتے ہیں۔ اور جب انسان کی بہیمیت ان پر نرغہ کرتی ہے تو ان کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ حفاظت میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن ان کا اصلی رنگ ناکامی میں نکھرتا ہے، ان کی ظاہری کامیابی سے ان کی پیش کردہ اقدار پر یقین اتنا راسخ نہیں ہوتا جتنا اس وقت ہوتا ہے جب باطل کی یلغار اتنی شدید ہوتی ہے کہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، شکست یقینی ہوتی ہے، اور یہ ناکامی اور شکست کے یقینی ہونے کے باوجود اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کے ساتھی نہیں بنتے، اس پر گالیاں کھاتے ہیں، ذلتیں سہتے ہیں، تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور اگر "یہ رتبۂ بلند" نصیب میں ہوتا ہے تو آخر کار جان کی نذر پیش کر کے اپنی سچائی کا آخری ثبوت دے دیتے ہیں اور انسانیت کو جتا دیتے ہیں کہ کامیابی اور اقتدار کی لاگ سے وہ کہیں یہ نہ سمجھ لے کہ ان اقدار مطلقہ کی سیوا بس اسی وقت تک ہے جب تک فتحمندیاں ہیں۔ نہیں، ان کے ساتھ رہ کر ناکامیاں دوسروں کے ساتھ کی کامیابیوں سے، اعلیٰ کی خاطر بدنامیاں ادنیٰ کے ساتھ کی

نیک نامیوں سے بہتر ہیں۔ ان کی جلو کی رسوائیاں بڑی بڑی کامرانیوں سے زیادہ رفیع اور ان کی سنگت کی تنہائیاں، لشکروں اور جیشوں پر قابلِ ترجیح ہیں۔ حسین انھیں اقدارِ مطلقہ کے علم بردار تھے، انھیں کے لیے جیے، انھیں کے لیے لڑے اور انھیں پر اپنی جان نثار کر گئے اور اپنی زندگی اور اپنی موت دونوں سے انسانیت کے لیے ایک دائمی شمعِ ہدایت روشن فرما گئے، اس شمع کی روشنی زندگی کے ہر شعبے میں راہ نما ہے، لیکن جماعتی زندگی کی گمراہیوں میں اس شمع سے اکتسابِ نور کی طرف خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

امتیازِ حق و باطل انسان کا فرض ہے

اسلام کے نزدیک دین کی بنا ر اقدار کی وحدت پر ہے، بنیادی اقدار حکم، حکمت، اور حق ہیں۔ حکمت اور حق بنیادی اقدار کی حیثیت سے معروف ہیں، میں صرف حکم کی تشریح کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے مراد ہے حکومت اقتدارِ اعلیٰ۔ ذرا سوچیے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نوعِ انسانی کی اچھی سیاسی تشکیل، عدل اور انصاف پر مبنی حکومت کا قیام انسان کی اخلاقی زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ اس لیے اچھی حکومت بھی ایک اخلاقی قدر رکھتی ہے اور اس کا ایک مکمل نمونہ ہماری ہدایت کے لیے ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا حکمت اور حق کا۔ اس کا نام حکم ہے۔ حکم، حکمت اور حق کو ایک ماننا اسلام کی تعلیم ہے، یعنی اسلام یہ کہتا ہے کہ حکم بھی اسی ذات کے لیے ہے جو عین حق اور عین حکمت ہے۔ عبادت یعنی غیر مشروط اور غیر محدود اطاعت صرف اسی کی کرنی چاہیے اور کسی کی نہیں۔ شرطوں کے ساتھ اور حدوں کے اندر دوسرے کی اطاعت بھی کی جا سکتی ہے مگر شرط اور حد یہی ہے کہ مجازی حکم، حقیقی حکم اور حکمت اور حق کے خلاف نہ ہو۔ اگر دنیا میں حکمِ حقیقی قائم ہو تو انسان کا کھلا ہوا فرض ہے کہ بغیر کسی شرط کے اس کی اطاعت کرے لیکن اگر حکمِ مجازی کا دور دورہ ہے تو اطاعت کے لیے شرطیں لگانی پڑتی ہیں جن میں سب سے پہلی چیز یہی ہے کہ انسان کو کوئی کام اس حکم کے خلاف نہ کرنا پڑے جسے وہ حکمِ حقیقی جانتا ہے۔

لیکن سب سے بڑی مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب حکمِ مجازی سراسر حکمِ حقیقی کے خلاف ہو اور انسان کو اس کی خلاف ورزی پر مجبور کرتا ہو۔ اس سے بڑھ کر مشکل جس کے تصور تک سے حق پسندوں کا دل کانپ اٹھتا ہے، یہ ہے کہ باطل کی حکومت یہ مطالبہ کرے کہ اسے حکمِ حقیقی سمجھا جائے، جب دنیا پر یہ مصیبت آئے تو آدمی کا فرض ہے کہ وہ قول سے، فعل سے، یہ اعلان کرے کہ باطل کی حکومت سراسر حکمِ حقیقی کے خلاف ہے، میں اس کے آگے ہرگز سر نہ جھکاؤں گا اور کوئی اس کے آگے سر نہ جھکائے۔ اس اعلان کا نام شہادت ہے، اس شہادت پر باطل کی قوتیں ٹوٹ پڑتی ہیں مگر اس کے سارے ظلم سہہ کر ہی مردِ حق دوسروں کو حق و باطل کا فرق دکھا سکتا ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ قدرِ اعلیٰ کو بے حجاب دیکھنے والے کم ہوتے ہیں اب یہ مردِ حق جو حکمِ حقیقی کو بے حجاب دیکھ رہا ہے دنیا کے کم نگاہوں کو کس طرح دکھائے، سوا اس کے کہ اس راہ میں قربانیاں کر کے اپنے عقیدے کی قوت سے دلوں کو پگھلائے، کبھی کبھی اس راہ میں جان دے کر آخری قربانی دینی پڑتی ہے۔ جو شخص جان دے کر باطل کے مقابلے میں آخر دم تک حق کا اعلان کرے وہی شہادت کے سب سے اونچے درجے پر فائز ہوتا ہے اور عام طور پر شہید صرف اسی کو کہتے ہیں۔

باطل سے جنگ

اب آپ تاریخ کے صفحات پلٹ کر دیکھیے اسلام کا ابتدائی زمانہ جسے مسلمان سب سے زیادہ اچھا سمجھتے ہیں، گزر چکا ہے۔ حکمِ حقیقی یعنی خلافتِ راشدہ کا دور ختم ہوتا ہے حکمِ مجازی یعنی ملوکیت کا دور آتا ہے۔ حکمِ حقیقی کے خلاف ملک کے محاصل ذاتی مِلک بنتے ہیں اور بادشاہ بہت بڑا خزانہ جمع کر کے دولت کے بل پر اپنی قوت بڑھاتا ہے اور عالمِ اسلامی کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔ کچھ لوگ ڈر سے کچھ لالچ سے سر جھکا دیتے ہیں بعض سر ایسے ہیں جو نہیں جھکتے، انھی میں رسول کے نواسے حسین کا سر ہے، لالچ، دھمکی، فریب سب سے کام لیا جاتا ہے مگر حسین یزید کی اطاعت سے انکار کرتے ہیں

بھلا حسینؓ جن کی رگوں میں علیؓ فاطمہؓ اور محمدؐ کا خون تھا جن کے دل میں حق کا خوف اور حق کا عشق تھا حکم باطل کو حکم حق کیسے کہہ دیتے؟ حسینؓ نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا گویا اعلان کر دیا کہ یزید کا حکم حکم باطل ہے۔ یہ پہلی شہادت تھی۔ ان کو ان کا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا، مکے میں بھی چین نصیب نہ ہوا، ترک وطن کر کے عراق کا قصد کیا، یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مجھے یزید کے حکم کے باطل ہونے پر اس درجہ یقین ہے اور اسے قبول کرنے سے اس شدت سے انکار ہے کہ ترک وطن کی تکلیف اٹھانے کو تیار ہوں، یہ دوسری شہادت تھی۔

کوفے کی راہ میں کربلا کے مقام پر یزید کے لشکر نے حسینؓ کی راہ روکی اور ان کا چھوٹا سا لشکر گھر گیا۔ اب آخری قربانی اور آخری امتحان کا سامنا تھا۔ حسینؓ نے آخری قربانی پیش آخری امتحان میں پورے اترے ان کے ساتھیوں اور عزیزوں میں ایک ایک مارا گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے قتل ہوئے آخر خود حسینؓ زخموں سے چور چور زمین پر گرے مگر ان کے دل میں یہی تھا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں حکم صرف اللہ ہی کے لیے ہے یہ تیسری اور آخری شہادت تھی۔

کہتے ہیں کہ جب لشکر شام والے حسینؓ کے اہل بیت کو اسیر کر کے اور کربلا کے شہیدوں کے سر نیزوں پر چڑھا کر لے چلے تو راہ میں ہر جگہ حسینؓ کا سر اللہ کی وحدت اور بڑائی اور اس کے حکم کی شہادت دیتا تھا۔ مذہبی عقیدت اس بات کو لفظاً بھی صحیح مان سکتی ہے مگر اس سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو واقعی حسینؓ کا سر جہاں جاتا ہوگا زبان حال سے حکم حق کی شہادت دیتا ہوگا۔ آج تیرہ سو سال بعد بھی حسینؓ کی مثال بلکہ حسینؓ کا نام اس کی شہادت دیتا ہے اور قیامت تک دیتا رہے گا کہ حکم صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔

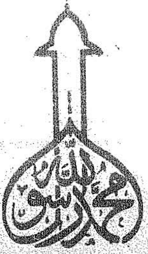
جب کبھی دنیا میں حکم حقیقی کی قدر تسلط ہوگا تو دنیا ضرور یاد کرے گی کہ اس کے سب سے بڑے محسنؐ کے نواسے نے کس طرح اس کی حمایت میں اپنی جان نذر دی تھی۔ جب دنیا میں افراد اور اقوام ان اقدار اعلیٰ کے سلوک کی حیثیت سے ارتقاء روحانی و ذہنی کے منازل سبک رفتاری سے طے کرتی ہونگی اور ان قدروں کے طالبوں کو ناکامی سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔ تو وہ ضرور یاد کرے گی کہ صدیوں پہلے ایک بے یار و مددگار حق پرست نے ناکامی سے ڈرے بغیر ان اقدار اعلیٰ کی حمایت کی ہمت کی تھی اور جب دنیا کی طاقت و جبروت اسکے خلاف تھی تو انہیں کی خاطر اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ جب دنیا صرف ایک خدا سے ڈرے گی اور اس طرح اوروں کے ڈر سے نجات پا چکی ہوگی تو وہ یہ نہ بھولے گی کہ فاطمہؓ کے لالؓ نے میدان کربلا میں اپنا سر کٹوا کر اس اطاعت اور اس سربلندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس وقت یہ بے نوا حکمرانوں کا حکمران دکھ دیا گیا، ناکام، دین و ایمان کا پشت پناہ نظر آئے گا اور اس کا خاک و خون میں لتھڑا ہوا سر الٰہی سطوت و جبروت کا علم معلوم ہوگا

بقیہ: تصویر کے دو رُخ

"سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور جس سے چاہتا ہے روک دیتا ہے۔ وہ جسے چاہے۔ اسے ذلیل کرے اور جسے چاہے اسے رفعت و بلندی بخشے۔ معاویہؓ بن سفیانؓ اللہ کی رسیوں میں سے ایک رسی تھے۔ جب تک اس نے چاہا دراز کیا اور جب چاہا قطع کر دیا۔ وہ پہلے والوں سے کمتر اور آئندہ والوں سے بہتر تھے۔ میں یہ کہہ کر اللہ تعالیٰ کے دربار میں ان کا تزکیہ نہیں کرتا وہ اس دنیا سے رخصت ہو کر اپنے رب کے حضور میں پہنچ گئے ہیں۔ وہ اگر معاف فرمائے تو یہ اس کی رحمت ہے۔ اگر سزا دے تو یہ ان کے گناہوں کا بدلہ ہے اور بیشک مجھے ان کے بعد ولی عہد بنایا گیا ہے۔ میں اپنے جہل کو چھپانا نہیں چاہتا اور طلب علم سے غافل اور مایوس نہیں ہوں۔ آپ لوگ یقین رکھیں کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو مکروہ خیال کرتا ہے اسے بدل دیتا ہے اور جس چیز کو وہ پسند کرتا ہے آسان کر دیتا ہے۔

یہ تمام حالات امیر شکیب ارسلان نے اپنی کتاب "محاضرات العرب والقسطنطیہ" میں طبقات ابن سعد کے حوالے لکھے ہیں اور ان کو مشہور شیعہ مؤرخ نے اپنی کتاب "ناسخ التواریخ" میں بیان کیا ہے۔ تاریخ اسلام کے مؤلف مولانا قاری احمد پیلی نے اپنی کتاب تاریخ بنو امیہ میں تصویر کے یہ دونوں رخ پیش کیے اور پھر آخر میں یہ لکھا ہے کہ یزید کے متعلق تصویر کا جو رخ داغلین بیان کرتے ہیں۔ حقائق کو پیش نظر رکھنے والے تمام مؤرخین نے اس کا سختی سے انکار کیا ہے۔ تاریخ مسلمانان عالم ص ۱۴۳





لا الٰہ الا اللہ

شہادتِ حسینؓ کا پس منظر

ادیانِ عالم میں شریعت محمدیہؐ کو ایک نمایاں اور واضح خصوصیت حاصل ہے۔ انسانی دائرہ فکر و عمل کی وسعت و ترقی نے محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت کو ایسے موقف تک پہنچا دیا تھا کہ دین کا صحیح اور حقیقی مفہوم اپنی کامل اور ناقابل تغیر صورت میں دنیا پر واضح کر دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعتِ محمدیؐ جہاں ایک طرف ہم کو خالق موجودات سے قریب تر اور وابستہ تر بنانے کا آسان ترین ذریعہ نظر آتی ہے وہیں انسانی مدنی و اجتماعی حیات کے لئے ایک آخری اور ناقابل تغیر نظام و ضابطہ پیش کرتی ہے۔ اس شریعت میں ہم مذہب کو عیسائیت اور بدھ مت کی طرح اپنے معبود کے ساتھ صرف روحانی تعلق کے پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں پاتے بلکہ اس کے ضوابط میں ایک فردِ انسانی کے دوسرے فردِ انسانی کے ساتھ۔ ایک قبیلہ کے دوسرے قبیلہ کے ساتھ۔ ایک قوم کے دوسری قوم کے ساتھ۔ ایک ملک کے دوسرے ملک کے ساتھ۔ تعلقات کا مکمل نظام بھی پاتے ہیں۔ اسلام نے اپنے اس اجتماعی نظام کی ابتداء عبادات سے کی اور انتہا نظام حکومت پر ہوئی۔ اسلام کی بتائی ہوئی نمازوں اور اس کے فرض کئے ہوتے ہونے کا درس دیا وہیں اس کے حج اور اس کی زکوٰۃ کے فرائض میں ساری دنیا کے انسانوں کو ایک عالمگیر نظامِ اجتماعی میں منسلک کر کے ان کی زندگی کو ایک کامیاب زندگی بنانے اور خدا کی خلافت کے منشاء حقیقی کو تکمیل کرنے کا سامان بہم پہنچا دیا ہے۔ غرض ہم اپنے نظامِ حیات کے کسی گوشہ کو مذہبی نورِ ہدایت سے محروم اور تاریک نہیں پاتے۔

اسلام کی تعلیمات کا یہی وہ پہلو ہے جو اسلام کو تمام ادیانِ عالم میں ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔ لیکن کوتاہ بین نگاہیں اسی مقام پر پہنچ کر ٹھوکر کھاتی ہیں اور افضل الانبیاء خیر البشر رحمۃٌ للعلمین صلوٰۃ اللہ علیہ کی حیاتِ مقدسہ پر اس اعتراض کی جرأت کرتی ہیں کہ (نعوذ باللہ) حضرت ختمی مرتبتؐ کا مقصدِ حیات اپنے لئے دنیوی حکومت و جاہ کی تلاش تھا جس کے لئے دنیا کے اس مقدس ترین بزرگ نے نبوت و رسالت کا ڈھونگ رچایا تھا۔ باسورتھ اسمتھ اور کارلائل جیسے مستشرقین کی نام نہاد اسلام نواز تصانیف کا بغور مطالعہ کرنے والا بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ میں ان مستشرقین کو اس لئے قابل معافی تصور کرتا ہوں کہ ان کے نزدیک عیسائیت کے مسلسل مطالعہ کی وجہ سے مذہب کا تصور ہی غلط تھا۔ وہ مذہب میں انسان کی اجتماعی اور مدنی زندگی کے لئے کوئی مقام ہی نہیں پاتے تھے۔ اور ان کو حیرت ہوتی تھی کہ ایک شخص جو لوائے رسالت ہاتھ میں رکھتا ہو اور تاجِ نبوت سے سرفراز ہو اس کو انسانی حیاتِ دنیوی کے اجتماعی پہلو سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ وہ اگر تھوڑا غور کرتے تو ان کی سمجھ میں آجاتا کہ اُخروی نجات و فلاح کا انحصار تمام ادیان عالم کی تعلیمات میں بالاتفاق دنیوی حیات کی کامیابی پر ہے اور تمام مفکرین عالم کے نزدیک انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے اس لئے اس کی دنیوی زندگی ہیئتِ اجتماعی کی کامرانی کے بغیر کامیاب ہو ہی نہیں سکتی لہٰذا وہ مذہب ناکام ناقص اور ترقی یافتہ انسانی جماعت کے لئے ناقابل قبول ہوتا جو انفرادی حیات کو سنوار رہا ہو اور اپنے اندر اجتماعی حیاتِ انسانی کے لئے کوئی آئین نہ رکھتا ہو۔ اگر انہوں نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا غور

جانبدارانہ مطالعہ کیا ہوتا تو اس کو محسوس ہو جاتا کہ ایک ایسی ہستی جس نے تمام عمر غیروں کی اصلاح میں صرف کر دی اور قدرت حاصل کرنے کے بعد بھی تعیشاتِ دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھا۔ جس کو رہنے کے لئے پھونس کے جھونپڑے کے سوا پختہ مکان۔ بیٹھنے کے لئے کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی کھرّی چٹائی کے نرم بستر اور کھانے کے لئے نانِ شعیر کے سوا کوئی اچھی غذا زندگی بھر میسر نہ ہوتی۔ جس نے مالِ غنیمت کے ڈھیر لٹا ہوتے ہوں لیکن جس کی بیویاں اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی ہوں اور جس کی بیٹی اپنے ہاتھوں سے آٹا پیستی اور اپنے نازک شانوں پر پانی کی مشکیں ڈھوتی ہو اس پر اعتباری حکومت پسندی اور ذلیل دنیوی جاہ طلبی کا الزام عقل سے محروم اور حقائق سے چشم پوشی کی بد ترین مثال ہے نہیں انکار کر سکتا ہوں اور نہ کسی سچے مسلمان کو انکار کی جراٴت ہو سکتی ہے کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکمل نظام حکومت کی بنیاد رکھی لیکن اس نظام حکومت میں دنیا کے فرسودہ تصورات حکومت اور تاریخ کے ملعون ومردود تخیلات فوقیت و برتری کا کوئی مقام نہ تھا۔ محمد عربی کا پیش کردہ نظام حکومت وہ خلافت الٰہیہ تھی جو منشاء آفرینش انسانی ہے "اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃ" جس کا مقصد حیات انسانی میں ایک اجتماعی ہم آہنگی پیدا کر کے اس کو منشاءِ خداوندی کے مطابق چلانے کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ آیئے! ہم اس اسلامی اور محمدی نظامِ حکومت کا سرسری جائزہ لیں تاکہ محمد کے نواسے کی فدویت اور خانوادۂ نبوت کی سرفروشی کا حقیقی راز ہماری سمجھ میں آجائے اور ہم اس یادگاروں کو مناتے ہوتے خود اپنے جادۂ حیات کی منزلوں کو متعین کر سکیں اور اپنے منشائے حیات کے صحیح تصور کے ساتھ اپنی زندگی کو محمد و آلِ محمد کے غلاموں کی زندگی بنا سکیں۔

حکومت کا اسلامی تصور

مجھے اجازت دیجئے کہ حکومت و سیاست کے ان تصورات کو سرسری طور پر تمہیداً آپ کے سامنے پیش کروں جو آج کل ہر ایک متعلم سیاست کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں تاکہ آپ ان کو سامنے رکھ کر اسلامی تصور حکومت کا صحیح زاویۂ نظر سے مطالعہ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ حکومت کے دو نمایاں اور واضح فرائض ہیں۔ ایک اپنے اندرونی نظام کو اپنے منظور کردہ آئین و ضوابط کے مطابق چلانا اور باشندگانِ مملکت میں امن اور ہم آہنگی قائم کرنا اور ان کے تمام جائز حقوق کی حفاظت کرنا۔ دوسرے اپنی مملکت کو اس طرح مضبوط اور قوی بنانا کہ وہ دوسروں کی دست برد و استیلاء سے محفوظ اور آزادی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکے۔ کوئی حکومت اپنے پہلے جزو کی تکمیل نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنے لئے کچھ قوانین و ضوابط نہ رکھتی ہو اور اس کے ہاں ایک ایسی جماعت موجود نہ ہو جو، ان ضوابط و آئین کے مطابق حکومت کی مشنری کو چلاتے اور نظم ونسق کو برقرار رکھے اور دوسری طرف باشندگانِ مملکت کے حقوق کی حفاظت کرے اور ان کے نزاعات و خصومات کا تصفیہ کرے۔ متعلمین سیاست انہیں سہ گونہ لوازمہ ہائے حکومت کی تکمیل کے لئے تین عوامل کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ایک ایسی جماعت جس کا کام قانون سازی ہو۔ دوسری وہ جماعت جو ان قوانین کو نافذ کرے۔ تیسرا وہ گروہ جو فصلِ خصومات اور باشندگان مملکت کے تحفظ حقوق کا فرض انجام دے ان کو ہم اپنی اصطلاح میں مقننہ، عدلیہ اور عاملہ کہتے ہیں آج دنیا کی ساری سیاسی کشمکش انہیں سہ گونہ اجزائے حکومت کی اصلاح اور ان کو مختلف انسانی گروہوں کے منشأ کے مطابق چلانے کے لئے ہے انسان نے جو ترقی کی تو اس نے برخود غلط یہ سمجھ لیا کہ اپنے نظام اجتماعی کو وہ کسی مافوق الانسان ہدایت و رہبری کے بغیر بآسانی چلا سکتا ہے اسلامی تعلیمات کی خصوصیت یہی ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے ہر گوشہ کو آسمانی ہدایت کا محتاج قرار دیا اور انسان کے لئے اجزاء وعمل کے فرض واختیار کو محفوظ کرتے ہوتے قانون سازی کا منبع صرف خدائے قدوس کی ذاتِ بزرگ و برتر کو یقین کیا، یہی وجہ ہے کہ ہم قرآنِ حمید کو اپنی

زندگی کے ہر گوشہ میں نور افشاں اور جلوہ پاش پاتے ہیں۔ اصول ضوابط و قوانین حیات کی تدوین رب العزت نے بنفس نفیس قرآن کے ذریعہ کی اور آج ہمارا صرف ایک ہی فرض رہ گیا ہے کہ ایک طرف ان کی تعمیل کریں اور دوسری طرف اپنی زندگی کی نئی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے انہی اصول کے تحت تفصیلی قواعد مرتب کریں۔

حضرت ختمی مرتبت ﷺ نے جس حکومت کی بنیاد رکھی وہ انہی قوانین الٰہیہ و ضوابط قرآنیہ پر قائم تھی اور اس کی عاملہ و عدلیہ کا فرض اُن بزرگ ترین ہستیوں پر عاید ہوتا تھا جن کو ملت اسلامیہ ان ضوابط کے سمجھنے اور ان کے جاری کرنے کی اہل تصور کرے۔ اور ان کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے مطابق شریعت کے احکام کا تابع بناتے اسلامی نظام حکومت میں خلافت رسول ﷺ یا اجرائے احکام الٰہیہ کا منصب صرف انہیں ذوات قدسیہ کو حاصل ہو سکتا تھا جنھوں نے مشکوٰۃ نبوت سے کماحقہٗ اکتساب نور کیا ہو اور علوم قرآنیہ کی مہارت تامہ رکھتے ہوں۔ صرف معارف اسلامیہ کی واقفیت کسی شخص کو مُفترض الطاعات نہیں بنا سکتی تھی جب تک خود اس کی زندگی کا ہر گوشہ عملاً ان احکام اور تعلیمات کا مظہر نہ ہو کوئی ایسا شخص جو قرآن کے استفہام "لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ" کا مخاطب ہو سکے امارت مُسلمین کے منصب عالی کا مستحق نہیں قرار پا سکتا تھا۔ وابستگان دامن نبوت کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت، اطاعت و انقیاد کو گوارا نہ کر سکتے تھے جس کی زندگی کا ایک ایک گوشہ اس کو سچا اور پکا مسلمان ثابت نہ کر رہا ہو۔ ریاست و حکومت کے وہ تمام تصورات پارینہ جو سُنت شداد و فرعون تھے پاش پاش ہو چکے تھے اسلامی نظام حکومت میں امیر ملت کا وہ خادم تھا جس کو حکومت بلا طلب ملت کی طرف سے عطا ہوتی تھی اور جب حاصل ہو جاتی تو اس کا سر اعزاز و افتخار سے بلند ہونے کی بجائے ذمہ داریوں کے بوجھ سے ہر وقت جھکا ہوا تھا۔ جس کو ملت کے خزانہ سے صرف اس قدر حاصل کرنے کا حق تھا جتنا اس کے قوت لایموت کے لئے کافی ہو اور اس کے متعلقین کو جن کی پرورش کا وہ ذمہ دار ہے معیشت کی فکر فردا سے آزاد کر سکے۔ نہ اس کے دروازے پر دربان ہوتے تھے نہ اس کے دربار میں نقیب اس کے سرہانے پتھر کا تکیہ ہوتا اور وہ کھجور کی پتیوں کے فرش پر سو کر ایرانی قالین کے بہار کا لطف اٹھاتا تھا۔ اس کی عبائے حکومت ایک گلیم پیوند دار ہوتی اور اس کا تاج سروری ایک عمامہ پارینہ۔ وہ ایوان حکومت میں احکام نافذ کر کے دنیا کے جباروں کو لرزہ بر اندام کرتا تھا تو اس کا سر ندامت ایک بے سہارا بڑھیا کے سامنے اشک آلود آنکھوں کے ساتھ جھک جاتا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت سرکشان عالم کی گردنوں کو خم کرتی تو تو اس کے دوش کسی بیکس بچے گھر کی لکڑیاں ڈھویا کرتے تھے۔ اس دربار میں غریب بڑھیا اور ذلیل غلام کو بھی حرف گیری و نکتہ چینی کا حق ہوتا تھا اور وہ اپنے فرائض کو کماحقہٗ ادا کر کے بھی دامن شب کو اپنے پیارے آنسوؤں سے تر کرتا تھا اور خدا کے عذاب سے ڈرتا تھا۔

یہ اسلامی نظام اجتماعی محمد رسول اللہ کا وہ عطیہ اور خدا کی وہ امانت تھی جس کی حفاظت یوں تو محمدؐ کو رسول سمجھنے والے ہر متنفس پر عاید ہوتی تھی لیکن جن کی نسبتیں محمدؐ سے قریب تر اور مضبوط تر تھیں۔ وہ اس فرض کو عظیم تر سمجھنے پر مجبور رہے۔ دنیا کی تاریخ ہمیشہ اس واقعہ کو افتخار کے ساتھ نمایاں کرتی رہے گی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر محمدؐ الرسول اللہ کے خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان حق شناس سے "لولا علی لہلک عمرؓ" کے الفاظ نکلے اور جبکہ محمدؐ رسول اللہ کے ایک فرض شناس اور نور قرآنی سے اپنے قلب و روح کو منور رکھنے والے مقرب نے خلیفۂ وقت کے فیصلہ میں سہو کو برداشت نہ کیا اور بلا اندیشۂ و سواس اس کو ظاہر کر کے ترمیم کروائی۔

خلافت راشدہ کے بعد

زمانہ گزر گیا ممالک فتح ہوتے گئے۔ اسلامی تعلیمات کو قبول کرنے والے دنیا کے

معلوم کے ایک ایک گوشہ میں پھیلنے گئے۔ عیسائیت، یہودیت و مجوسیت سے اسلام کی طرف رجوع کرنے والوں نے اپنے تصوراتِ قدیمہ کو اسلام میں داخل کرنا شروع کیا۔ احکامِ الٰہیہ پر مصالحِ وقت کو غلبہ حاصل ہوتا گیا۔ انسانی رائے مذہب میں مقام پیدا کرتی گئی۔ خدا چھپنے لگا نفس اُبھرتا گیا اور اسلامی تصورِ حکومت میں رفتہ رفتہ قیصریت و کسرائیت کی بو آنے لگی۔ محمدؐ کی جانشینی کا معیار اہلیت کی بجائے وراثت بننے لگا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں روحِ محمدؐ بے چین نظر آئی اور کسی کی رگوں میں خونِ محمدؐ کھولنے لگا اور امانتِ محمدؐ کی حفاظت کے لئے آلِ محمدؐ برسرِ دار نظر آنے لگے۔

فتنۂ وراثت

حضرت علی اسد اللہ الغالب کرم اللہ وجہہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت اور امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں خلافت سے دست برداری کے بعد خلافت کی نسبت تمام قضیے جنہوں نے اس وقت کے عالمِ اسلامی کو تہ و بالا کر رکھا تھا ختم ہو چکے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے پیش رؤں کے طرز پر حکومتِ اسلامیہ کے نظام کو چلانا شروع کیا اور اساس اسلامی متزلزل نہ ہونے دی

حضرت معاویہؓ ان اختلافات سے قطع نظر جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد ان کے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے درمیان پیدا ہو گئے تھے بہر حال فیض یافتۂ دبستانِ نبوت تھے اور اسلامی کی آئینہ دار نہ ہو۔ جس کے متعلق تعلیماتِ قرآنی سے کاتبِ وحی کی حیثیت میں بھی واقفیت رکھتے تھے خود حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ان کی خلافت پر بیعت کرنا ان پر اجماعِ امت کے اتفاق کی آخری مُہر تھی سارے اصحابِ رسولؐ نے ان کی خلافت و امارت کو قبول کیا اور اسلامی فتوحات کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔ مجھ جیسے ہیچ میرز کو سزاوار نہیں کہ ایک صحابیٔ رسولؐ پر خردہ گیری کروں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی نظامِ حکومت میں بنیادی اور اصولی طور پر فتنہ کی بنیاد اس وقت اور صرف اس وقت پڑی جبکہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو ولیعہدی کے لئے پسند کیا۔ ان کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اسوۂ حسنہ موجود تھا کہ جب وہ اس دنیا سے کوچ کرنے لگے ہیں اور ابولولوء کے پہنچائے ہوئے زخم ان کے آخری لمحاتِ حیات کو قریب تر کرتے جا رہے ہیں لیکن ملّتِ مرحومہ کے مستقبل کے تصور نے ان کے سارے جسمانی کرب کو فراموش کر دیا ہے اور جانشینِ محمد الرسول اللہ کا انتخاب ان کے پیشِ نظر ہے اس وقت کسی نے ان کے سامنے ان کی جانشینی کے لئے ان کے فرزند عبداللہ کا نام لیا۔ اُن عبداللہ کا نام لیا جو بدر کے معرکہ آرائوں میں شریک تھے۔ جو اتباعِ سنتِ رسول اللہ میں خود صحابہؓ کے نزدیک سند تصور کئے جاتے تھے جن کا علمِ قرآن مُسلّم تھا اور جن کے تقویٰ کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ ان کا نام جب خاتم النبیین کی خلافت کے لئے پیش ہوتا ہے تو حضرت عمرؓ کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو جاتا ہے اور آپ بسترِ مرگ پر تڑپ جاتے ہیں۔ کاش حضرت معاویہؓ نے اپنی زندگی میں اصحابِ رسولؐ کو جمع کر کے اپنے عہد کے بہترین شخص کو تلاش کر لیا ہوتا۔ ولی عہدی کے لئے

یزید کے انتخاب نے اسلامی اصولِ اجتماعی کی بنیاد ہلا دی۔ کیسے ممکن تھا کہ رسولؐ کا نواسہ اور وارثِ تعلیماتِ نبوی کا سرتاج دنیا میں موجود تھا اور وہ اس چیز کو برداشت کر لیتا۔ دنیوی حیثیت سے وہ بے سہارا تھا افواج یا عساکر اس کے زیرِ کمان نہ تھے تاج و تخت پر اس کو اقتدار حاصل نہ تھا لیکن اس کے قلب میں قرآن تھا۔ اس کی نگاہوں میں ایمان کا نور تھا اور اس کی زبان پر لا الٰہ الا اللہ کی شہادت تھی۔ اس کا سر اس کے قبضہ میں تھا وہ اس کے کٹانے پر قدرت رکھتا تھا لیکن اس کا ہاتھ جان بوجھ کر ایسے شخص کی بیعت کے لئے نہ بڑھ سکتا تھا جو قرآن اور حاملِ قرآن کے قائم کئے ہوئے معیارِ خلافت پر پورا نہ اُترتا ہو جس کے ہاتھ میں اگر قوانینِ الٰہیہ اور احکامِ اسلامیہ کی روح کے مٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ جس کی زندگی خود احکام

مشہور ہو کہ وہ امر کا پابند نہیں اور نواہی سے پرہیز نہیں کرتا۔ حضرت امام حسینؑ (خداوند قدوس کی ساری رحمتیں اور برکتیں ان پر نازل ہوں) اپنی کس مپرسی اور بے سر وسامانی کے باوجود اس کو برداشت نہ کرسکے اور یہی ان کی شہادت کا پس منظر اور تاریخ عالم کے اس عدیم المثال سانحہ کی علتِ اصلی ہے۔

شہادت کی حقیقت

حق و باطل کی ستیزہ کاری اس عالم کون و فساد کا قدیم ترین دستور رہا ہے اور اس کی ایک خصوصیت تاریخ کے ہر دور میں نمایاں رہی کہ باطل سارے ساز و سامان کے ساتھ آراستہ رہا۔ ہمیشہ اس کا تخت سیم و زر کے انبار پر قائم ہوا۔ ہمیشہ اس کے جلو میں طاقت و جبروت کی فوجیں ہوئیں اور حق تنہا آیا بے زر آیا بے وسیلہ آیا۔ نمرود کے دربار میں آذر کا بیٹا ہو یا فرعون کے حضور میں بنی اسرائیل کا یتیم تم اس خصوصیت کو ہر جگہ نمایاں پاؤ گے مردانِ حق کی سب سے بڑی طاقت جس نے دولت کے اس ڈھیر کو خاکستر بے مایہ اور سطوت و جبروت کو عہن منفوش بنا دیا۔ وہ ان کی لازوال استقامت اور بے مثال ثباتِ قدم تھا۔ لبا اوقات داعیانِ حق دنیائے اعتبار کے نزدیک شکست خوردہ و ناکام ہوئے لیکن ان کی ہر شکست میں ایک تعمیر اور ان کی ہر ناکامی میں ایک کامیابی مستتر رہی وہ خود مٹ گئے۔ لیکن عقل و خرد کی دنیا کو بنا گئے وہ خود پاش پاش ہو گئے۔ لیکن اپنے بعد اصول کا ایک فنا نہ ہونے والا نشان چھوڑ گئے۔ دنیا نے جب کبھی اپنی تعمیر کا قصد کیا انہیں کے خرابوں پر اپنی بنیاد رکھی اور انہیں کے نشان قدم کو اپنے لئے مشعل راہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ شہادت نگاہ ظاہر بین کے لئے موت لیکن قلب حق شناس کے لئے حیات ابدی تصور کی گئی۔ "ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا تشعرون" راہ حق میں مرنے والے کو شہید اس لئے کہتے ہیں کہ جب وہ اپنی دنیوی سعی و عمل میں ناکام ہو جاتا ہے اور فقدان اسباب دنیوی کے باعث اہل باطل سے اپنے آپ کو منوا نہیں سکتا۔ زمانہ کو اپنے لئے ناسازگار پاتا ہے اور اہل زمانہ کو اپنے ساتھ نہیں لے سکتا تو رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہونے والا حق پرست امروز کو چھوڑ کر فردا کی فکر کرنے لگتا ہے اور جب اس کے قدم حدود اللہ کی انتہا پر پہنچ جاتے ہیں تو باطل کی سرحد میں پاؤں رکھنے کی بجائے وہ اپنے خونِ سرخ و گرم کی ایک واضح نمایاں اور نہ مٹنے والی لکیر حق و باطل کے دوراہے پر کھینچ دیتا ہے تاکہ پیچھے آنے والے رہ نوردانِ حق اس کو دیکھ کر اپنی منزل کا پتہ لگا لیں اور اس کا خون چمکتا ہوا اور باطل کی نگاہوں کو خیرہ کرتا ہوا خون، نظر نہ آنے مگر محسوس ہونے والا خون، قیامت تک باطل سے انکار اور حق کی اتباع میں شہادت دیتا رہے۔ ان کی یہی شہادت و گواہی وہ حیات جاوید ہے جو جریدۂ عالم پر ان کے دوام کو ثبت کر دیتی ہے۔ دنیا مٹ جاتی ہے لیکن وہ نہیں مٹتے":

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اسرارِ شہادتِ حسین

امام حسینؑ یزید کے مقابلہ میں اعتباری فتح حاصل نہ کر سکے۔ عمرو ابن سعدؓ کی فوجوں کو شکست نہ دے سکے۔ شمر باطل پرست کے خنجر کو نہ روک سکے کوفہ اور دمشق کو ان کی فوجوں نے سر نہیں کیا۔ انہوں نے اپنا سب کچھ اپنے ہاتھوں کربلا کے میدان میں لٹا دیا۔ اپنے جوان اور ہم شبیہ رسول بیٹے کی نعش کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوئی زمین پر تڑپتے دیکھا۔ اپنی آغوش میں مسکراتے ہوئے علی اصغر کو دم توڑتے برداشت کیا۔ اپنے بھائی کی امانت قاسم جانباز کو اپنی زبان سے میدانِ جنگ کی اجازت دے دی اپنی بہن کو اور زینبؓ جیسی بہن کو اپنی مرضی سے جگر کے ٹکڑوں کا داغ برداشت کرنے پر مجبور کیا عباسؓ جیسے بھائی کی مفارقت کی پرواہ نہ کی اور سب سے آخر میں اپنے بیمار بیٹے۔ اپنی نازوں کی پلی ہوئی۔ اپنی ماں جائی بہن۔ اپنی عزیز جان بیٹی اور اپنے سارے خاندان کو وحشت و کرب و بلا میں بے کس و بے سہارا چھوڑ کر آپنے آپ کو راہ حق میں قربان کر دیا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

یادِ حسینؓ

(امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ)

شمعہا بردہ ام از صدق بخاک شہدا
تا دل و دیدۂ خوننابہ فشانم دادند

تمہید

حادثۂ کبریٰ اور شہادتِ عظمیٰ وقائع و حوادث اسلامیہ کا وہ عظیم الشان واقعہ ہے جو تاریخ اسلام کی اولین صدی سے لے کر اس وقت تک اپنے عجیب و غریب تاثرِ ماتم و درد اور حیرت انگیز بقائے ذکر و تاثیر کے لحاظ سے نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تمام حوادث مخزنۂ عالم میں ایک عدیم النظیر امتیاز رکھتا ہے اگر وہ تمام آنسو جمع کئے جائیں جو ۶۱ھ سے لے کر اس وقت تک اس واقعہ جانسوز پر بہائے گئے ہیں۔ اگر وہ تمام دودِ آہ و فغانِ سوزان یکجا کیا جا سکے جو ان تیرہ صدیوں کی لاتعد و لاتحصیٰ اسلامی نسلوں کی صدا ہائے ماتم کے ساتھ بلند ہوتا رہا ہے، اگر درد و کرب کی وہ تمام چیخیں، اضطراب و الم کی وہ تمام پکاریں، سوزش و تپش کی وہ بیقراریاں، اکٹھی کی جا سکیں جو اس حادثۂ کبریٰ کی یاد نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اندر ہمیشہ پیدا کی ہیں، تو کون کہہ سکتا ہے کہ خون فشانیہائے حسرت کا ایک نیا اوقیانوس سطحِ ارضی پر بہہ نہ جائے گا؟ دودِ آہ و فغان کی ہزارہا بھٹیاں بھڑک نہ اٹھیں گی؟ اور درد و الم کی چیخوں، حسرت کی صداؤں، تڑپ کی بے چینیوں کے ہنگامہ خونیں سے تمام عالم ایک شورزارِ نالہ و بکانہ بن جائے گا؟

تاہم میں جو پیام فرزندانِ اسلام تک پہنچانا چاہتا ہوں وہ اس تذکرہ سے بالکل مختلف ہے۔ میں غم و الم کی شدت و کثرت کے اعتراف کی تاریخ نہیں ہوں، بلکہ اس عدیم النظیر شدت و کثرت کے بعد بھی آنسوؤں کی طلب ہوں، آہوں کی صدا ہوں، بے قراری کی پکار ہوں اضطراب کی دعوت ہوں، اور آہ! آہ! اے صد ہزار آہ و حرمان کہ غم کے لئے بھوکا ہوں اور درد و الم کے لئے یک قلم پیاس ہوں، پس میں آج اُن آنکھوں کا تذکرہ نہیں کرتا جو بہت رو چکی ہیں، مجھے اُن آنکھوں کا سُراغ بتلاؤ جو اب بھی رونے کے لئے نم آلود ہیں، میں اُن دلوں کی سرگذشت نہیں سناتا جو تڑپتے تڑپتے تھک چکے ہوں، میں ان دلوں کی تلاش میں نکلا ہوں جو اب بھی تہہ و بالا ہونے کے لئے مضطرب ہیں! مجھے اُن زبانوں سے کیا سروکار جن کو فغان سنجی ہائے ماضی کا ادعا ہے؟ آہ، میں تو ان زبانوں کے لئے پکار رہا ہوں جن کے اندر غم و ماتم کی بھٹیاں سلگ رہی ہیں اور ان کا دھواں آج بھی کائنات نشاط نادانی کی اس تمام فضاء غفلت کو مکدّر کر سکتا ہے جس کو عیش و عشرت کے قہقہوں میں درد و عبرت کی ایک آہ بھی نصیب نہیں!

نہ داغِ تازہ می خارد نہ زخم کہنہ می کارد!
بدہ یارب دلے، کیں صورت بے جاں نمیخواہیم!

دعوتِ درد

ہاں، یہ سچ ہے کہ رونے والے اس پر بہت روئے، ماتم کرنے والوں نے ماتم میں کمی نہ کی آہ و نالہ کی صداؤں نے ہمیشہ ہنگامۂ الم کی مجلس طرازیاں کیں، اور یہ سب کچھ اب تک اتنا ہو چکا ہے، جتنا آج تک شاید ہی دنیا کے کسی حادثۂ غم کو نصیب ہوا ہو۔ تاہم تم یقین کرو کہ بایں ہمہ اس حادثۂ عظیمہ کی دعوتِ اشک و حسرت اب تک ختم نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی دعوتِ درد کے اندر جو حقیقی طلب تھی، وہ اب تک لبیک کے سچے استقبال سے محروم ہے۔ تیرہ صدیاں مع اپنے دورانِ محرم و عشرۂ ماتم کے اس پر گذر چکی ہیں لیکن اب تک خاکِ کربلا

کے وہ ذرّاتِ خون آشام، جن کو آج بھی اگر نچوڑا جائے تو خونِ شہادت کے مقدس قطرے اس سے ٹپک سکتے ہیں، بدستور آنسوؤں کے لئے پکار رہے ہیں، خون فشانیوں کے لئے داعی ہیں، آہ و فغان کے لئے تشنہ ہیں، اضطراب و التہاب کے لئے بیقرار ہیں، اور فضاء رنگ راز کرب و بلا کا ایک ایک گوشہ اب تک دیدہ ہائے اشک افشاں، جگر ہائے سوختہ دلہائے دو نیم، اور زبان ہائے ماتم سرا کے لئے اسی طرح چشم براہ ہے، جس طرح سنہ ۶۱ ہجری کی ایک آتش خیز دوپہر میں خون کی ندیوں کی روانی، تڑپتی ہوئی لاشوں کے ہنگامہ احتضار، اور ظلم و مظلومی، جرح و مجروحی، قتل و مقتولی کے ہنگامۂ الیم کے اندر سے نالہ سازِ طلب اور فغاں فرمائے دعوت تھا۔

شدیم خاک و لیکن بہوئے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

لیکن اگر یہ دعوتِ درد محض اس پانی کے لئے ہے جو ندیوں کی جگہ آنکھوں سے بہے، اگر یہ طلب غم محض ان صداؤں کے لئے ہے جن کا غوغا درختوں کے جھنڈ، چڑیوں کے گھونسلوں، دریاؤں کے بیراں کی جگہ انسانوں کی زبانوں سے بلند ہو، اگر یہ انتظارِ الم محض اس ماتم کے لئے ہے جو پتھروں کے ٹکرانے کی جگہ انسانی دست و سینہ کی ٹکر سے ہنگامہ ساز ہو، تو اے برادرانِ غفلت شعار! وائے چشمانِ خواب آلود! بلاشبہ یہ سب کچھ ہو چکا، اور بلاشبہ سوال کو جواب، دعوت کو لبیک اور طلب کو مطلوب مل چکا۔ اگر انسان کا بچہ بھوک سے روتا اور روٹی کے لئے آنکھوں کو سرخ کر لیتا ہے تو انسانوں کے بڑے بڑے گروہ کیوں نہیں آنسو بہا سکتے؟ اگر درختوں کے جھنڈ ہوا سے ہل کر چند لمحوں کے لئے دنیا کو شور و غوغا سے لبریز کر سکتے ہیں تو آدم کی اولاد اپنی آہ و بکا سے کیوں آسمان کو سر پہ نہیں اٹھا سکتی؟ اگر بے جان و بے روح پتھر دوسرے پتھر پہ گر کر رعد و برق کا ہنگامہ پیدا کر سکتا ہے، تو تم کہ روح اور ارادہ رکھتے ہو! اپنے دست ہائے ماتم کناں سے کیوں ایک ہنگامہ زار دہشت گرم نہیں کر سکتے؟ کیا تم کو دنیا کی ان آنکھوں کی خبر نہیں جو روتی ہیں حالانکہ ان سے ایک آنسو بھی نہیں بہا؟ کیا تم نے ان زبانوں کے متعلق کچھ نہیں سنا جو چیختی ہیں حالانکہ انہوں نے ایک چیخ بھی نہ پائی؟ اور کیا تم نے ان جسموں کا تماشہ نہیں دیکھا جو تہہ و بالا ہوتے ہیں حالانکہ ان کو ایک تڑپ بھی نصیب نہ ہوئی؟ پھر کیا اس غفلت آباد ہستی ہیں وہ دل بھی نہیں ہیں جو گو دل ہیں، مگر دل نہیں ہیں، کیونکہ دل کی طرح نہیں سوچتے؟ کیا وہ کان بھی نہیں ہیں، جو گو سامع ہیں مگر کان نہیں ہیں، کیونکہ نہیں سنتے؟ اور کیا ایسی آنکھیں بھی نہیں ہیں، جو گو بصیر ہیں، مگر آنکھیں نہیں ہیں کیونکہ نہیں دیکھتیں؟ لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا، اولٰئک کالانعام بل ھم اضل واولٰئک ھم الغافلون! (۷ : ۱۷۸)

درد و الم کی یہ پاک دعوتیں صرف اس روانیٔ آب، تسلسلِ صداء اور ہنگامۂ غوغائی ہی کے لئے نہیں ہوتیں جو آنسوؤں فغاؤں، اور ماتموں کے نام سے ظہور میں آجاتیں۔ اور اگر ان کا یہی مقصد ہوتا تو اس کے لئے انسان کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ کتنے ہی سمندر پانی سے بھرے ہوتے ہیں، اور کتنے ہی جنگل شور و غوغا سے ہنگامہ زار ہیں، بلکہ یہ دعوت، یہ پکار، یہ طلب، یہ "ہل من مجیب" فی الحقیقت اُن آنسوؤں کے لئے ہے جو صرف آنکھوں ہی سے نہیں بلکہ دل سے بہیں، وہ اُن آہوں کا دھواں مانگتی ہے جن کی لٹیں صرف منہ ہی سے نہیں بلکہ اعماقِ قلب سے اٹھیں، وہ صرف ہاتھوں ہی کے ماتم کے لئے نہیں پکارتی بلکہ دل کے ماتم کی محض ایک صدائے حقیقت کے لئے تشنہ ہے۔ اگر تمہارے پاس اس کے لئے آنکھوں کا آنسو نہ ہو تو اسے کوئی شکایت نہیں، لیکن آہ تمہاری غفلت، اگر تمہارے پہلوؤں میں کوئی زخم نہ ہو جس سے پانی کی جگہ خون بہے! اگر تمہاری زبانوں کو درد کی چیخ نہیں آتی تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آہ یہ کیا ہے کہ تمہارے دلوں کے اندر حقیقت

شناسی کی ایک ٹیس، عبرت کی ایک ٹیک، بصیرت کی ایک تڑپ، احساس صحیح و حق کا ایک اضطراب بھی نہیں ہے؟

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

اللہ اللہ سید الشہداء مظلوم کی مظلومی، اور یا للعجب غفلت و نادانی کی بوقلمونی!!! اس سے بڑھ کر دنیا میں "مظلومی" کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمنوں اور دوستوں، دونوں نے اس پر ظلم کیا۔ دشمنوں نے اس کی شہادت عظیمہ کی عظمت مٹانی چاہی، مگر دوستوں نے بھی اس کی شہادت کی اصلی حقیقت و بصیرت سے غفلت کی دشمنوں نے اس پر ظلم کیا کیونکہ اس کی مظلومی پر انہیں رونا نہ آیا پر ان دوستوں نے بھی ظلم کیا جو گو روتے مگر اس کی اصلی تقدیس و شرف کے لئے سچائی اور عمل کا ایک آنسو بھی نہ بہا سکے۔ دشمن تو دشمن تھے، اس لئے انہوں نے اس کی دعوت حق کو مٹانا چاہا، مگر دوست دوست ہو کر بھی اس کی دعوت کی پیروی نہ کر سکے! وترا ھم ینظرون الیک وھم لا یبصرون (۵۶ : ۸۵)

بس سچا ماتم وہی ہے جو صرف ہاتھ کا نہیں بلکہ دل کا ماتم ہو اور دعوتِ درد کا اصلی جواب وہی ہے جو عبرت و بصیرت کی زبان سے نکلے۔ تمہاری آنکھیں اس حادثے پر بہت رو چکی ہیں، مگر اب تک تمہارے دل کا رونا باقی ہے، اور اگر رونا ہے تو اپنے دل کو رلاؤ ورنہ صرف آنکھوں کی اس روانی کو لے کر کیا کیجئے جس میں دل کی اشک افشانی کا کوئی حصہ نہیں ہے، حالانکہ انسان کی ساری کائناتِ حیات صرف دل ہی کی زندگی سے ہے: فانہا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور:

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے — کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

غرض مطلب یہی ہے کہ اس حادثۂ عظیم پر غور و فکر کی ایک نئی صفِ ماتم بچھائیں، اور ان حقیقتوں اور بصیرتوں کی جستجو میں نکلیں جن پر آنکھوں کی اشک افشانیوں سے زیادہ دل کے زخموں سے خون بہتا ہے اور ہاتھوں سے زیادہ روح پر ماتم طاری ہوتا ہے۔ فذکر ان الذکریٰ تنفع المؤمنین۔

یادگارِ مشاہیر کی حقیقت

سب سے پہلی چیز جو اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ اس واقعہ کی یادگار اور اس کا دائمی تذکار ہے۔

دنیا میں ہر قوم نے اپنے ماضی کے اُن واقعات و حوادث کی ہمیشہ تعظیم کی ہے جن کے اندر قوم و ملک کے لئے کوئی غیر معمولی تاثیر یا عبرت پائی جاتی تھی، اور ہمیشہ اُن انسانی بڑائیوں اور عظمتوں کی یاد کو یادگاروں، تہواروں، عمارتوں، تاریخوں، قومی روایتوں، اور قومی مجمعوں کے انعقاد کے ذریعہ زندہ رکھنا چاہا ہے جن کے اندر خود اس قوم کی کوئی عظمت اور بڑائی پوشیدہ ہے۔

یہی چیز ہے جس کو تمام اقوام متمدنہ نے "مشاہیر پرستی" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور یہی چیز ہے کہ ہر قوم اپنی قومیتوں کے بڑے بڑے بانیوں، مذہبی معلموں، محب الوطنوں، اور قومی شہیدوں کی یاد کو کبھی بھی مفقود ہونے نہیں دیتی۔

ہومر نے ایلیڈ لکھی، کالڈیا کے حجری[۱] کتب خانے میں وہ اینٹیں رکھی گئیں جن پر نامورانِ ملت کے مناقب و محامد کندہ تھے، عرب جاہلیت نے اپنے سلسلۂ انساب کا ایک حرف ضایع ہونے نہ دیا اور ذو المجیز اور عکاظ میں اسلاف کے کارناموں کی داستان سرائی قائم کی، مصریوں نے ایسے ایسے مینار بنائے جو ہزاروں برسوں کے بعد بھی اپنی تعمیر اولین کی طرح محکم و استوار ہیں۔ اور پھر ان کے اندر اپنے ناموروں کی لاشوں کو "ممی" کی صورت میں محفوظ کر دیا۔ ہندوستان نے مہابھارت کے معرکے کو قومی روایتوں میں داخل کر دیا، اور

۱؎ حجری کتب خانہ سے مقصود تمدنِ بابل و کالڈیا کا وہ عہد مدنی ہے جب کہ کتابیں پتوں اور درخت کی چھالوں کی جگہ پتھر پر کندہ کر کے لکھی گئیں اور جن کا بڑا ذخیرہ بابل کے آثار عتیقہ میں موجود ہے۔

والمیک کی سحر طرازیوں نے نسلی مفاخر کی روح کو پژمردگی سے بچایا۔ اقوام قدیمہ کے یہ تمام اعمال صرف اسی حقیقت کے لئے تھے کہ اسلاف و مشاہیر کی یاد زندہ و قائم رکھی جائے۔

آج اوقیانوس کا بحری مسافر واشنگٹن کے بت کو ساحل امریکہ پر دیکھ کر دور سے پکار اٹھتا ہے، یورپ کے بڑے بڑے شہروں اور ان کی محکوم نوآبادیوں کی شاہراہوں اور باغوں میں جابجا سنگی بت نصب نظر آتے ہیں، شکسپیر کا مولد ابتک قائم ہے، ملٹن کی میز کو مرنے نہیں دیا جاتا، جانسن کے آثار اب بھی ہر شخص دیکھ سکتا ہے میلان میں ایک جگہ یہ سنگی کتبہ تم پڑھو گے: پاک میزینی نے یہاں اپنا بچپن گذارا تھا"

یہ سب کچھ بھی اسی مشاہیر پرستی کی زیادہ خوشنما دلفریب شکل ہے، جو پہلے محض قومی روایتوں اور افسانہ طرازیوں کے ذریعہ قائم رکھی جاتی تھی۔

لیکن یہ امر بالکل ظاہر ہے کہ اس تذکار و یادگار کا اصلی مقصد کسی واقعہ کو محض یاد رکھنا، یا کسی نام کو فراموش سے محفوظ رکھنا ہی نہ تھا بلکہ کچھ اور ہی مقصد تھا۔ کیونکہ اگر یہی مقصد ہوتا تو اس کے لئے خاص نام، کسی خاص واقعہ، کسی خاص حادثہ میں کوئی ممتاز خصوصیت نہ تھی پچھلوں کو اگر محض یاد ہی رکھنا ہے، تو اس کے لئے بڑا اور چھوٹا، ادنیٰ، و اعلیٰ نیک و بد سب یکساں ہیں۔ کونسی وجہ ہے کہ کارتھیج کے مشہور ہنی بال کو یاد رکھا جائے، اور ٹیٹس کو یاد نہ رکھا جائے، سو وہ اصلی روحِ حقیقت جو اجتماعِ انسانی کی اس سب سے زیادہ پرانی رسم کے اندر کام کر رہی ہے، دراصل ناموں، وجودوں، شخصیتوں، اور محض تذکرہ و یادآوری سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ اس سے اصلی غرض یہ تھی کہ جو اعمالِ حسنہ، عزائمِ مہمہ، نتائجِ عظیمہ، اور بصائر و مواعظِ جلیلہ ان مشاہیر اور ناموروں کی زندگی سے وابستہ ہیں، اور جن کی یاد اور تذکرہ کے اندر قوموں اور ملکوں کے لئے سب سے زیادہ موثر اور نافذ دعوت عمل و اتباع ہے، ان کی یاد کو ہمیشہ قائم رکھا جائے اور مختلف ذریعوں سے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں جن کی وجہ سے کبھی بھی آیندہ نسلیں ان اعمالِ حسنہ کے نمونوں کو اپنی نظروں سے اوجھل ہونے نہ دیں۔

پس یادگار دراصل انسانی افراد کی نہ تھی، بلکہ انسان کے بہترین اعمال کی تھی، اور تذکرہ و یادآوری شخصوں اور حادثوں کی نہ تھی، بلکہ ان سچائیوں کی تھی جو وہ اپنی زندگی کے اندر رکھتے تھے۔ خدا نے ذات کی بڑائی اور عظمت صرف ہی کبریائی کے لئے مخصوص کرلی ہے، اور دنیا کو جو کچھ دیا گیا ہے، وہ صرف "عمل" کی بڑائی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان بڑا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ بڑا صرف ایک ہی ہے، اور وہ فاطر السموات والارض ہے البتہ "عمل" بڑا ہو سکتا ہے، اور اس کی بڑائی سے اس کے حامل کے اندر بھی نسبتی اور اضافی بڑائی آجاتی ہے، پس ساری تعظیمیں، ساری تقدیسیں، ہر طرح کا احترام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وسع کرسیہ السموات والارض

صدق اللہ العظیم

نفیس الحسینی

۱۵ جنوری ۱۹۷۵

وشرف جو دنیا میں کیا جا سکتا ہے، یا تو خدا کے لئے ہے یا پھر خدا کی سچائی اور اس کے قرار دیئے ہوئے اعمال حسنہ کے لئے۔ خود انسان کی ذات کا اس میں کوئی حصہ نہیں: الحمد للہ رب العالمین میں "الحمد" کے الف لام کا یہی مطلب ہے اور:- انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (۴۹: ۱۳) سے اسی روشنی پڑتی ہے اور یریدون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳: ۱۸۸) (یہ بدبخت چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف وثنا ان اعمال کے لئے کی جائے جو انہوں نے نہیں کئے۔ حالانکہ "حمد" کا استحقاق تو اعمال ہی کو تھا) اسی کی مزید توضیح کرتا ہے: وما یعقلها الا العالمون! (۲۹: ۴۳)

ایک عالمگیر غلطی

لیکن دنیا کا خسران صرف اسی میں نہیں ہے کہ وہ سچائی کی طرف نہیں بڑھتی، بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ بسا اوقات اس کی جانب قدم تو اٹھاتی ہے پر ایسا ہوتا ہے کہ راہ ہی گم ہو جاتی ہے، اور جس طرح اس کی طرف نہ چل کر اس سے محروم تھی، ٹھیک ٹھیک اسی طرح اس کی طرف چل کر بھی محروم رہتی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ قرآنِ حکیم نے انسان کے نقصان وخسران کے جو مختلف حالات بیان کئے ہیں، ان میں سے ایک زیادہ عام اور زیادہ پیش آنے والی حالت کے لئے "ضلالت" کا لفظ اختیار کیا ہے۔ سورہ فاتحہ میں "مغضوب علیہم" کے ساتھ ایک اور گروہ کا باسم "الضالین" تذکرہ کیا گیا ہے۔ "ضلالت" کا ٹھیک ٹھیک ترجمہ تم کو معلوم ہے کہ "گم راہی" اور راستے میں بھٹک جانے" کے ہیں۔ اسی لئے متحیر اور غیر متعین نظر رکھنے والے پر بھی "ضال" کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ کوئی متعین راہ اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ پس قرآن کریم نے نوعِ انسانی کی بدحالی وتباہی کی سب سے بڑی عام حالت کو اسی لفظ سے تعبیر کیا، اور اس میں بڑا نکتہ یہ ہے کہ بسا اوقات انسان کو اٹھنے اور چلنے سے انکار نہیں ہوتا۔ وہ سفر تو کرتا ہے۔ پر ہوتا یہ ہے کہ منزل مقصود کی حقیقی شاہراہ اس پر نہیں کھلتی، اور وہ راہ ہی میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ باوجود چلنے کے منزل مقصود سے اسی طرح محروم رہتا ہے جس طرح وہ شقی محروم رہا، جس نے چلنے کا قصد ہی نہیں کیا تھا۔ یہی حقیقت اصطلاحِ قرآنی میں "حبط اعمال" کی ہے جس پر جا بجا مختلف پیرایوں میں زور دیا گیا ہے کہ فحبطت اعمالھم (۱۸: ۱۰۴) (ان کی تمام محنتیں، کوششیں اور راہ روی کی مشقت بالکل اکارت گئی۔ اور اس کا کوئی پھل انہیں نہ ملا)

چنانچہ اس "ضلالت" عمل کی ایک عمدہ مثال دنیا کی عالمگیر "مشاہیر پرستی" بھی ہے جو مقصد کے لحاظ سے ایک نہایت اہم، عظیم المنفعت، حیات پرور، اور سعادت بخش حقیقت تھی، لیکن بایں ہمہ اس بارے میں ہمیشہ قوموں نے غلطی کی، اور اکثر حالتوں میں سخت ٹھوکر کھائی۔ وہ دنیا کی عالمگیر ضلالت کبریٰ جو اس کے ہر عمل میں حقیقت اور مقصد کو فنا کرتی اور ظواہر ورسوم کی اس سے پوجا کراتی ہے، افسوس کہ اس حقیقت کے لئے بھی ہلاکت بخش ہوئی، اور گمراہیوں اور حقیقت ناشناسیوں سے اس عظیم عمل کو آلودہ کر دیا گیا کہ بسا اوقات ہدایت کی جگہ ضلالت کا ایک بہت بڑا پتھر ثابت ہوئی۔

انسان کی عالمگیر غلطی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کی روح کے لئے اختیار کرتا ہے، لیکن آگے چل کر صرف اس کے جسم ہی پرستش کرنے لگتا ہے۔ مشاہیر وسلف پرستی کا اصلی مقصد تو اعمال حسنہ کی یاد اور نیکی وصداقت کے عملی نمونوں کو پیروی واتباع کے لئے قائم رکھنا تھا، لیکن نتیجہ بالعموم یہ نکلا کہ اعمال کی یاد مٹ گئی، اور محض انسانوں کی شخصیتوں اور ناموں کی پوجا ہونے لگی۔ یعنی وہ چیز کہ کسی دوسرے مقصد کے لئے واسطہ وذریعہ تھی۔ خود ہی مقصود بالذات بن کر لوگوں کے عقائد واعمال میں جاگزیں ہو گئی اور حقیقت سے اس قدر بُعد ونسیان ہو گیا کہ محض رسوم واسماء کی عظمت و پرستش ہی پر ہر شخص قائم ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ مشاہیر پرستی بسا اوقات دنیا میں بُت پرستی کا ذریعہ ثابت ہوئی ہے، اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ اعمال کی جگہ افراد واسماء پرستشِ محض نے دو تین نسلوں کے بعد انسان کو بُت پرستی تک پہنچا دیا۔

اُسوۂ حسنہ

یہی حقیقت اعلیٰ ہے جسے قرآن حکیم نے "اُسوۂ حسنہ" کے جامع ومانع لفظ سے تعبیر کیا ہے، اور یہی مقام ہے جہاں اگر اسلام کی قوتِ اصلاح اور ختمِ نبوت کی اصلی علت آشکارا ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس نے دنیا کی تمام صداقتوں کو لے لیا؟ اور ساتھ ہی کس طرح اُن تمام خرابیوں اور ضلالتوں سے محفوظ بھی کر دیا جن کے اختلاط و آلودگی سے ان کی روحِ حقیقت اور تاثیرِ عمل بالکل فنا ہو گئی تھی؟:

لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید! قرآن ایک ایسا معلم و ہادی ہے کہ نہ تو اس کے آگے باطل جم سکتا ہے، اور نہ اس کے پیچھے اسے جگہ مل سکتی ہے، وہ خدائے حکیم و حمید کا اتارا ہوا ہے۔ پھر باطل کا یہاں کیا گذر؟ (۴۱: ۴۲)

ہاں باطل کیوں کر اب اس کے ساتھ مل سکتا ہے جبکہ وہ "حقِ خالص" ہے، اور سچائی کے ساتھ جس قدر بھی گمراہی ملا دی گئی تھی، اس نے انسان کے ہر اعتقاد و عمل کو بالکل صاف و پاک کر دیا ہے؟ نیز جابجا قرآن حکیم کو "ہادی" کہا کہ وہ انسان کو اس کے سفرِ اعمال میں ٹھوکروں اور گمراہیوں سے بچاتا ہے، اور اسی طرح "شفا" کہا، کیونکہ وہ مثل مفید و نافع ادویہ کے ہے جو مریض کی اصلی قوت طبیعی کو مزید توانائی اور نشو و نما دیتی ہیں، اور مضر اثرات مرض جو داخل طبیعت ہو گئے ہیں، ان کو دور کر دیتی ہیں!

"اُسوۂ حسنہ" کہتے ہیں کسی فکر، کسی عمل، کسی وصف، کسی خاصہ کے ایک ایسے نمونے کو، جسے تم اس لئے اپنے سامنے رکھ لو کہ اس کی پیروی اور نقل کرو گے اور اس کی سی باتیں اپنے اندر بھی پیدا کرنا چاہو گے۔

انسانی سعادت کے لئے تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک اس تعلیم کے زندہ نمونے بھی انسانوں کے سامنے نہ ہوں۔ جو اثر طبیعت منفعلۂ انسانیہ پر ایک انسانی نمونۂ عمل کا پڑتا ہے، وہ محض تعلیم کی سماعت سے نہیں پیدا کیا جا سکتا اخلاق کی کتابیں اپنی موثر تعلیمات سے انسانوں کو رُلا سکتی ہیں مگر اس کے دلوں کو نہیں پھیر سکتیں۔ عدالت کا قانون مجرم کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال سکتا ہے لیکن اس کو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ حکماء کے حکیمانہ نصائح نیکیوں کی بڑی بڑی تعریفیں اور بدوں کی بڑی بڑی برائیاں بتلا سکتے ہیں۔ لیکن کسی برے انسان کو نیک بنا سکتے:

بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد!

لیکن برخلاف اس کے اگر ایک پاک انسان اپنی زندگی کے اندر نیکی کا عملی نمونہ رکھتا ہو: اور اس کے اعمال حیات راست بازی کے لئے "اُسوۂ حسنہ" کا حکم رکھتے ہوں، تو وہ صرف اپنا نمونہ دکھلا کر نہ صرف افراد و اشخاص کو، بلکہ اقوام و امم کے اعمال کو یکسر پلٹ سکتا ہے!

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایتِ خلق اللہ کے لئے صرف کتابوں اور شریعتوں ہی کو نہیں بھیجا، بلکہ اس کے ساتھ انبیاء کرام علیہم السلام کا (کہ ان کے حامل تھے) عملی نمونہ بھی دکھلا دیا۔ وہ جس دستور العمل کی طرف قوم کو بلاتے تھے اس کا عملی پیکر خود ان کی پاک و مطہر زندگی تھی۔ اگر شریعت بصورت قانون تختیوں اور کاغذوں پر منقوش تھی، تو بصورت وجود حی قائم ان کی زندگی کے اندر بھی پڑھی جا سکتی تھی۔ اگر اس کی آیاتِ بینات حروف و اصوات کی شکل میں دنیا کو دعوت دیتی تھیں، تو انبیاء کرام کی زندگی عمل و فعل کے اندر سے اس کی تصویر دکھلا سکتی تھی۔ اگر قانون کہتا تھا کہ انسان کو ایسا کرنا چاہئے، تو حیاتِ نبوی ثابت کر کے دکھلا دیتی تھی کہ اس طرح کیا گیا اور اس طرح کیا جا سکتا ہے!

یہی حقیقت ہے جس کو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اُس وقت بیان کیا تھا جبکہ ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و اعمال کا حال پوچھا گیا تھا کہ "کان خلقہ القرآن" اگر تم ان کے خُلقِ عظیم کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو قرآن کو دیکھ لو۔ یہاں حروف و الفاظ ہیں، وہاں ایک پیکر مجسم تھا۔ یہاں قوت ہے وہاں فعل تھا یہاں چراغ ہے، وہاں اس کی روشنی تھی، حقیقت ایک ہی ہے جس نے ایک جگہ علم کی اور دوسری جگہ عمل کی صورت پائی ہے!

اور یہی وجہ ہے کہ "سنت" کتاب کا ایک حقیقی جزو اور

مفہوم "کتاب" میں تبعاً داخل ہے۔ کوئی علیحدہ اور مستقل وجود نہیں رکھتی۔ جو ظاہر بین اس حقیقت سے بے خبر ہیں وقرآن کے ساتھ "حدیث" کا لفظ سنتے ہیں تو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں کر سکتے وہ سمجھتے ہیں کہ "حدیث" کی پیروی کا مطالبہ ایسا مطالبہ ہے جو "قرآن" کے علاوہ ایک دوسری قوت کا اثبات کرتا ہے حالانکہ "سنّت" کی اطاعت "کتاب" کی اطاعت میں داخل ہے۔ اور "سنّت" علم قرآنی ہی کی عملی تفسیر ہے۔

اور اگر یہ سچ ہے کہ جناب امیرؓ نے خوارج و منکرین کے مقابلہ میں فرمایا تھا کہ "میں قرآنِ ناطق ہوں" تو میں اس کی تصدیق کرنے کے لئے تیار ہوں اگرچہ حقیقت ناشناس طبیعتیں سمجھتی ہیں کہ یہ بہت ہی بڑا دعویٰ تھا۔ یقیناً یہ بڑے سے بڑا دعویٰ تھا جو کوئی انسان کر سکتا ہے، لیکن اگر حضرت امیرؓ نے کیا تھا تو غلط نہ تھا۔ اگر ان کی مقدس زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے "اُسوۂ حسنہ" کا ایک کامل عکس تھا، اور ان کے اعمال کی روشنی سراجِ منیر رسالت ہی سے ماخوذ تھی، تو کیوں انہیں یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے تئیں "قرآنِ ناطق" کہیں؟

جو کتاب الٰہی ما بین الدفتین حروف و نقوش کی شکل میں تھی اسی کی ہستی ناطق تھی جو اعمالِ حضرت مرتضویؓ کے اندر سے پکارتی تھی۔ خوارج سمجھتے تھے کہ یہ علی ابن ابی طالبؓ کی آواز ہے لیکن ابوذرؓ اور سلمانؓ کی حقیقت شناسی جانتی تھی کہ یہ علی بن ابی طالبؓ کی آواز نہیں ہے بلکہ "القرآن الحکیم" کی صدائے الٰہی ہے اور چونکہ "القرآن" کی آواز ہے، اس لئے یقیناً خود منزل القرآن کی آواز ہے: کنت سمعہ الذی یسمع بہ ولسانہ الذی تیلکم بہ (بخاری)

بہرحال یہ بحث بجائے خود محتاج تفصیل و نظر ہے۔ مختصر یہ کہ سعادت و ہدایت انسانی کے لئے "تعلیم" کے ساتھ "نمونہ" اور "کتاب" کے ساتھ "سنت" ایک ضروری حقیقت ہے۔ اسی لئے قرآنِ حکیم نے اپنی تعلیمات کے لئے اس چیز کو ایک اساسی حقیقت قرار دیا۔

قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین بلاشبہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نورِ ہدایت آیا، اور کتاب الٰہی جس کی تعلیم بالکل واضح اور روشن ہے۔ (۵: ۱۷)

اس آیۂ کریمہ میں "نور" سے مراد حامل قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود اقدس ہے اور "کتاب مبین" قرآن ہے۔ یہ "نور" وہی "اُسوۂ حسنہ" ہے جو حامل قرآن کی مقدس زندگی میں "علم" قرآنی کا وجود عملی تھا: لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ بلاشبہ تمہارے لئے اللہ کے رسول کی زندگی میں پیروی و اتباع کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے۔ (۳۳: ۲۱)

عربی میں "اُسوہ" کا لفظ ہر نمونہ کے لئے کہا جاتا ہے، اور نمونہ جس طرح خیر کا ہو سکتا ہے اسی طرح شر کا بھی ہو سکتا ہے اس لئے قرآنِ حکیم نے "حسنہ" کے لفظ سے اسے متصف کیا، تاکہ واضح ہو جائے کہ فضائل و محاسن ہی کا نمونہ مقصود ہے اسی طرح تمہیں معلوم ہے کہ سورۂ ممتحنہ میں بھی دو جگہ ملّت حنیفی و فطری کے اولیں موسس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہی لفظ آیا ہے: قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ

دنیا میں اعمال مقدسہ و حسنہ کی یادگار قائم کرنے کا مقصد بھی یہی "اسوہ حسنہ" تھا، یعنی جن لوگوں نے کسی پاک و اعلیٰ عمل کا بہترین نمونہ اپنی زندگی میں پیش کیا ہے، ان کی یاد کو ہمیشہ باقی رکھا جاتے تاکہ ان کی یاد کے ساتھ ان کے اعمال کی یاد بھی تازہ ہوتی رہے اور اس کا نمونہ انسانوں کو عزائم اُمور کی طرف دعوت دے۔

اب دیکھو کہ قرآنِ حکیم نے کس طرح دنیا کی اس قدیم ترین رسوم کی اصلی حقیقت لے لی، اور کس طرح اس کی آلودگیوں کو اُس سے بالکل الگ کر دیا؟ اس نے یادگاروں کے لئے پتھر کے بت نہیں بنائے جن کو حوادث ارضی کا ایک طمانچہ گرا دے سکتا ہے، اور جن کا وجود انسان کی عظمت کے لئے ایک سخت داغ تھا۔ اس نے اینٹ اور چونے کی عمارتیں نہیں بنائیں جو طوفان و برق کے ایک حملے کی بھی تاب نہیں لا سکتیں

اور جن کا اثر ظواہر سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس نے سالانہ مجمعوں اور قومی تقریبوں پر زور نہیں دیا کیونکہ یہ وسائل ہمیشہ ظواہر و رسوم پرستی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور یادگاروں کی معنویت مفقود ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ اس نے ان تمام وسایل تذکار سے یک قلم انکار کر دیا۔ جو عام طور پر تمام قوموں میں رائج تھے، اور جن کے ذریعہ خود انسانوں کی بڑائی تو کی جا سکتی تھی، پر عمل کی تقدیس و تعظیم کے لئے ان کے اندر کچھ نہ تھا، اور اس لئے ہمیشہ ان کا وجود انسان کی حقیقت پرستی کی راہ میں ایک سخت پتھر ثابت ہوا تھا۔

سورۂ کریمۂ فاتحہ

اب ہم کو تمام تمہیدوں اور مقدمات کی مبادیات سے گزر کر اصل موضوع کے قریب زیادہ تیز قدمی کے ساتھ آنا چاہیئے۔ یاد ہو گا کہ اس مقالہ کی ابتدا سورۂ مبارکۂ فاتحہ" سے کی گئی تھی۔ جسے بظاہر اصل موضوع سے کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا۔ "السبع المثانی" ہے وہ تمام "الکتاب" کا متن ہے، اور وہ اس کی تمام تفصیلات کا وجود اجمالی ہے، پھر ہدایت انسانی کا کونسا مقام ہے جو قرآن کے احاطۂ بیان سے باہر رہ گیا ہو؟

غرضکہ قرآن حکیم نے یادگار و تذکار کے ان تمام رسمی و ضلالت آمیز طریقوں سے انکار کر دیا جو عام طور پر دنیا نے اختیار کر لئے تھے۔ لیکن جبکہ اس نے وہ سب کچھ نہ کیا جو سب کوئی کرتے آتے تھے، تو سوال یہ ہے کہ خود اس نے کیا کیا؟

اُس نے "اسوۂ حسنہ" کی اصلی حقیقت کو اپنی تمام تعلیمات کا جزوِ اعظم بنایا، اور اس کی یادگاروں کو انسان سے باہر نہیں جن کو انسان چھوڑ دے سکتا ہے، بلکہ خود انسان کے اندر قائم کر دیا جو کبھی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ اس نے مادی و جسمانی اعمال و اشکال کے اندر اس کی دعوتِ عمل و سعادت کو گم نہیں کر دیا، جیسا کہ گم کر دی گئی تھی، بلکہ اس کو ایک خالص معنوی و روحانی اعتقاد بنا کر اس طرح دلوں کے اندر قائم کر دیا کہ

اس کی حقیقت دائمی طور پر زندگی، اور ہر طرح کی آلودگیوں اور رسم پرستیوں کی آمیزش بالکل محفوظ و مصئون بنا دی گئی!

اس نے سب سے پہلے ہمیں ایک مقدس "دعا" بتلائی، اور حکم دیا کہ دن میں پانچ مرتبہ جب اپنے پروردگار کے حضور بندگی و نیاز کے لئے حاضر ہو تو سب سے پہلے اسی دُعا کو پڑھو۔ یہ وہ وقت ہو گا جب تم رَبُّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے، اور اس کی رحمت کا دروازہ باز ہو گا۔ پس ایک عاجز و درماندہ انسان فاطر السموات والارض کے حضور جا کر اپنے لئے سب سے بڑی نعمت اور سب سے زیادہ قیمتی دولت جو مانگ سکتا ہے، وہ اس دعا میں مانگی گئی ہے، اور چاہیئے کہ تم اُسی نعمت کے سائل، اسی مطلوب کے طالب، اور اسی محبوب کے عاشق ہو!

یہ "دُعا" سورۂ فاتحہ ہے جو ہر مومن دن میں پانچ مرتبہ نماز کی ہر رکعت کے اندر پڑھتا ہے۔ اور وہ "نعمت" و "دولت"، وہ متاعِ مطلوب و محبوب "الصراط المستقیم" ہے جس کے مانگتے رہنے اور طلب کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اھدنا "الصراط المستقیم" خدایا! تو ہمیں الصراط المستقیم پر چلنے کی توفیق دے!

یہ "الصراط المستقیم" کون سی راہ ہے اور اس سے مقصود کیا ہے؟ اس کی یہاں کوئی تشریح نہیں کی گئی۔ البتہ یہ بتلایا گیا ہے:-

صراط الذین انعمت علیھم ان لوگوں کی راہ (فاتحہ) جن پر اے پروردگار تو نے انعام کیا۔

پس اس تصریح سے صراط مستقیم وہ راہ ہوئی جو "انعام یافتہ" لوگوں کی راہ ہے۔ یعنی جن لوگوں پر خدا نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں۔ انہی کی راہ عمل الصراط المستقیم ہو گی۔

چنانچہ سورۂ نساء میں "انعام یافتہ" جماعتوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ "انعمت علیھم" میں کن لوگوں کی طرف اشارہ تھا؟

ومن یطع اللہ والرسول فاؤلٰئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولٰئک رفیقا! (۴ : ۷)

اور جن لوگوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو وہ سب ان خوش نصیبوں کے ساتھی ہو جائیں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے۔ اور جن پر انعام کیا ہے وہ انبیاء ہیں، صدیقین ہیں، شہدا ہیں، اور صالحین ہیں، جس کسی کو ایسی انعام یافتہ جماعتوں کی معیت ملی، تو کیا اچھی ہے اس کی معیت اور کیا اچھے ہیں اس کے رفیق!!

اس آیتِ کریمہ نے صاف صاف بتلا دیا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جس "الصراط المستقیم" کے تعین کیلئے صرف اس قدر اشارہ کیا گیا تھا کہ وہ "انعام یافتہ لوگوں کی راہ" ہے، وہ کون لوگ ہیں؟ نیز ان کے مختلف مدارج و مقامات کیا کیا ہیں؟ جن جماعتوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اور انھیں انعام یافتہ کہا ہے، انھی کی راہِ عمل وہ راہِ ہدایت و سعادت ہوگی جس کا نام لسانِ الٰہی نے "الصراط المستقیم" رکھا ہے اور جس پر چلے بغیر کوئی فرد اور کوئی قوم "مغضوب علیہم" اور "الضالین" کی صراط مغضوبیت و ضلالت سے الگ نہیں ہو سکتی۔

سورۂ نساء کی اس آیۃ کریمہ سے "انعمت علیہم" کی مزید تفسیر و تشریح کرنا ایک ایسی مسلم اور متفق علیہ تفسیر ہے جسے عہدِ صحابہ و اہلِ بیتِ نبوت رضوان اللہ علیہم سے لے کر طبقاتِ متاخرہ تک تقریباً تمام اربابِ علم و رسوخ نے اختیار کیا ہے اور مفسرین خاصہ و عامہ سب نے اسے قبول کیا ہے، چنانچہ جس طرح محدث ابن جریر طبری نے اس کے متعلق مفسرین صحابہ کے آثار جمع کئے ہیں اسی طرح علامہ کلینی اور شیخ طبرسی (صاحبِ تفسیر مجمع البیان) بھی اس سے انکار نہیں کرتے۔ اس عاجز نے "تفسیر البیان القرآن" میں تصریحات حضرات ائمہ کرام و اقوالِ مفسرین خاصہ بھی نقل کر دیے ہیں۔ فمن شاء التفصیل فلیرجع الیہ

بہرحال یہ آیتِ کریمہ بتلاتی ہے کہ جس راہ پر چلنے کی سورتِ فاتحہ میں ہر مومن التجا کرتا ہے۔ وہ راہ "انعام یافتہ" گروہ کی ہے۔ انعام یافتہ گروہ چار ہیں: الانبیاء، الصدیقون، الشہداء، الصالحون۔

اب دیکھو کہ قرآن حکیم نے یادگار کے اصلی مقصد کو تمام آلودگیوں اور ضلالتوں سے صاف کر کے کس طرح قائم کر دیا ہے اور اس کے لیے کیسی دائم و قائم اور محفوظ و مصئون راہ اختیار کی ہے، اس نے نیک انسانوں اور اعلیٰ ترین ہستیوں کی یادگاریں زمین پر قائم نہیں کیں لیکن ان کے اعمال کو ہر مومن کے دل پر نقش کر دیا۔ اس نے ہر مومن باللہ پر پانچ وقت کی نماز فرض کی اور حکم دیا کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرو۔ سورۂ فاتحہ کیا ہے؟ تحمید و تقدیس کے بعد ایک التجا ہے جو انسان اپنے خدا کے حضور کرتا ہے۔ وہ التجا کیا ہے؟ "الصراط المستقیم" پر چلنے کی التجا ہے، تاکہ اس راہ کی اسے توفیق ملے، اور سعادت کونین حاصل ہو۔

اب اور آگے بڑھو اور دیکھو کہ "الصراط المستقیم" کونسی راہ ہے جسے ہر روز دن میں پانچ بار ہر مومن یاد کرتا اور اپنے خدا کے حضور جا کر مانگتا ہے؟ فرمایا کہ وہ ان لوگوں کی راہ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا۔ یہاں اس راہ کا طریق حصول یا اس کے عقائد و اعمال نہیں بتلائے گئے بلکہ صرف ان لوگوں کی طرف توجہ دلادی گئی جنھوں نے ایسے عقائد، ایسے اعمال، ایسے عزائم، ایسے اقدام کئے تھے جن کی وجہ سے خدا کی نعمتوں کے مستحق ٹھہرے تھے۔ یہی چیز "یادگار" ہے، یہی "تذکار" ہے، یہی وہ "مشاہیر پرستی" کی حقیقت اصلی ہے جس کو تمام دنیا نے ڈھونڈھا مگر نہ پایا، وہ کبھی پتھر کے بتوں، کبھی اینٹوں کی عمارتوں، کبھی انسانوں کے مجسموں کبھی ملکوں اور قوموں کی وقتی رسموں اور تقریبوں میں بھٹک کر رہ گئی اور "صراط الذین انعم اللہ علیہم" کی جگہ "الضالین" کی صراط پر چلی گئی۔

"مشاہیر پرستی" کے زوائد کو چھوڑ دو صرف اس کی اصلی حقیقت کو اپنے سامنے لاؤ، وہ کیا ہے؟ کیا صرف یہی نہیں ہے کہ جن انسانوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دئے ہیں اور نیکی و صداقت کی راہ چلے ہیں، ان کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھا جائے، تاکہ ان

کی یاد ان کے مقدس کاموں اور نیک عملوں کی یاد کو تازہ کردے اور اس یاد آوری و تازگی سے قوموں کے لیے پاک ارادوں اور اعلیٰ کاموں کے کرنے کی تحریک ہو؟ اگر یہی ہے تو کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورۂ فاتحہ کے اندر یہی حقیقت کس طرح کارفرما ہے؟ سورۂ فاتحہ نے انسان کی راہِ سعادت و ترقی کے لیے نہ عقائد و افکار بیان کیے اور نہ اعمال و افعال، بلکہ ان انسانوں کی طرف توجہ دلائی جو انعام یافتۂ الٰہی تھے، یعنی جو انسان راہِ سعادت کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ انعام یافتہ انسانوں کی یاد کو ہر روز اپنے سامنے لائے اور ان کے عقائد و اعمال کے نمونے کو کبھی فراموش نہ کرے۔ پھر اگر یہ دنیا کی پاک عمل ہستیوں کی سچی یادگار اور ان کا حقیقی تذکار نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یقیناً یہ تذکار ہے، مگر ایسا تذکار جو اپنے خصائص کے لحاظ سے تمام دنیا میں کوئی نظیر نہیں رکھتا۔

پھر ان انعام یافتہ لوگوں کی تشریح کی کہ وہ انبیاء ہیں، صدیقین ہیں، شہداء ہیں، صالحین ہیں۔ پھر ان میں سے ہر گروہ کے وہ اعمال حسنہ جابجا قرآن حکیم میں مشترح بیان کیے جن سے "الصراط المستقیم" کی راہِ سعادت متعین ہوتی ہے۔ قصص القرآن کی اصلی غرض اسی "انعمت علیہم" کی تفسیر سمجھو۔

یہ چار گروہ وہ ہیں جن کے اندر نوعِ انسانی کا بہترین حصہ آگیا اور انسانی عمل کی سچائی جب کبھی ظاہر ہوگی تو ضرور ہے کہ انہی انعام یافتہ چار جماعتوں میں سے کسی جماعت سے متعلق ہو، پس غور کرو کہ تم یادگار یادگار پکار رہے ہو، تمام دنیا مشاہیر پرستی کے لیے بے قرار ہے۔ کرۂ ارضی کی ہر متمدن انسانی جماعت انسانی بڑائیوں کی یادگار قائم کرنا چاہتی ہے، لیکن یہ کیسی یادگار کی عجیب و غریب خالص حقیقت ہے جو اس کی تمام خرابیوں کو دور کرکے قرآن حکیم نے ہمیں عطاء کی ہے، دنیا کی ہر قوم صرف اپنے ہی بڑوں کو یادگار کا مستحق سمجھتی ہے اور زیادہ سے زیادہ چند بڑے انسانوں کو یاد رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے کرۂ ارضی کی تمام حقیقی بڑائیوں اور اعمال صالحہ کے تمام گھرانوں کو چن لیا اور حکم دیا کہ تم ان سب کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھو اور سب کے بڑے بڑے کاموں، بڑے بڑے عزموں، بڑی بڑی نیکیوں سے اپنی راہ ایمان و اسلام کو مرکب و متقوم بناؤ۔ تم یادگاریں بنا کر سال میں ایک مرتبہ انھیں یاد کر سکتے ہو، اور عمارتی و سنگی اشکال میں کبھی کبھی ایک غلط انداز نظر ڈال سکتے ہو، اس سے زیادہ تمہارے تذکار کی حقیقت کچھ نہیں ہے، لیکن دیکھو تمہارے قرآن نے کیسی یادگار قائم کی جو ہر روز دن میں پانچ مرتبہ ہر مومن انسان کے سامنے آتی ہے اور صرف ایک ہی بڑے انسان کو نہیں بلکہ تمام راست باز انسانوں کو جو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین میں گذرے، وہ یاد کرتا اور ان کے اعمال مقدسہ کے نمونوں پر چل کر راہِ سعادت کی منزل مقصود تک پہنچنا چاہتا ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں ورنہ تعمیل نہ ہو سکے گی۔

زندہ ہے آج بھی وہ حقیقت لبِ فرات

(قاری عبد اللطیف)

تعلیم و تربیت کے شعبے میں تحقیق کرتے کرتے آج کی ترقی یافتہ دنیا اس آخری نکتہ پر پہنچی ہے کہ بچوں کی فلاح اور تربیت کے تمام طریقوں سے صحت مند اور سود بخش طریقہ صرف اور صرف یہ ہی ہے کہ والدین اور اساتذہ اپنے پیار سے انہیں مالا مال کر دیں۔ قطع نظر اس کے کہ پیار ان کا فطری حق ہے۔ یہ طریقہ سب نئے پرانے طریقوں کا سفوف ہے۔ اس زمانہ میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ یورپین پروفیسر تھامس کارلائل نے اپنے ایک طویل مضمون کی ان الفاظ پہ تان توڑی ہے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ یا شاگرد بڑا ہو کر پہلے چھوٹے چھوٹے پھر بڑے سے بڑے کاموں میں بھی ذمہ داری کا ثبوت دے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنا محبت کے خزانے سے اس کا دل غنی کر دیں کہ محبت ہی ذمہ داری کی جان ہے۔ ابتدائی چند سالوں میں جس نوعیت کا سلوک بچوں سے روا رکھا جائے گا وہ ہی ان کی سرشت ہو گا۔ لیکن آپ ذرا ان قرنوں صدیوں اور زمان و مکان کے فاصلوں کو طے کر کے چشم تصور سے ۱۴ صدیاں پیچھے کی طرف دیکھئے کہ وادئ حجاز کا ایک یتیم بلکہ دُرِّ یتیم جو کہ ساری دنیا کا معلّم بن کر آیا تھا اس نے اپنی عالمگیر اور ہمہ گیر تعلیم و تربیت کے لیے اس سے کہیں اعلیٰ وارفع طریق اختیار کیا تو بہ دقت تمام آج ہم نے ڈھونڈ نکالا۔

بلاشبہ جو سفر مادیّت کسی دور میں طے کرتی ہے روحانیت ہزاروں برس پہلے وہ طے کر چکی ہوتی ہے حضورؐ نے اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کے اتنے پیار سے فرمائی کہ بقول حضرت انسؓ (جو) بچپن میں دس برس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھتا رہا، ہزاروں غلطیاں ہوتی ہیں مگر کبھی محسنِ انسانیت نے کبھی مجھے نہیں ڈانٹا۔

آپ کی اصول تعلیم و تربیت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ رعونت زدہ صحرائی بدو جو یہ بھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ان کا کوئی داماد بنے، اس قدر سنجیدہ، مہذب، ذمہ دار اور نڈر بنے کہ پھر جب تک دنیا میں رہے غالب رہے۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہم۔

دیکھئے کس قدر پُر وقار تھے؟ بلال حبشی کو امیر المومنین عمرؓ ابن الخطاب نے بھی انہیں آقا کہہ کر پکارا۔ اور کتنی معتدل مزاج تھی وہ عورت جس نے حضرت عمرؓ کو بر سرِ منبر ٹوکا۔ اور کتنی متوازن تھی وہ بڑھیا جس نے ہارون الرشید کو ڈانٹا۔

اسی مخصوص انداز سے آپؐ نے حسنینؓ کی تربیت فرمائی۔ آپؐ کو ان سے بے حد لگاؤ تھا۔ حتیٰ کہ حضورؐ رکوع و سجود میں بھی اگر ہوتے اور حسنینؓ پیار سے اوپر سوار ہو جاتے تو سیّدنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کمال شفقت سے ان کے الگ ہونے تک رکوع اور سجود ہی میں رہتے۔ کہ مبادا سر اٹھانے سے حسنینؓ گر جائیں ——— اللہ اکبر!

راویؓ کہتا ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر میں نے حسینؓ کو سوار دیکھا تو میرے منہ سے نکل گیا "خوب! کتنی اچھی سواری ہے" تو حضورؐ نے یہ الفاظ کہہ کر فقرہ مکمل فرما دیا کہ "کتنا اچھا سوار ہے" ——

کوئی غیر مسلم مورخ بھی یہ ثابت نہ کر سکا کہ آپؐ نے کبھی تعلیم و تربیت کی غایت سے کسی بچے کے چہرے پر دھپڑ رسید کیا ہو؟ ایسی درسگاہ کے بچوں کو جب بھی کسی کربلا میں آزمایا گیا تو تاریخ گواہ ہے ان کا سر کٹا ضرور مگر جھکا نہیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۶۰۳۷

The Weekly "KHUDDAMUDDIN"

LAHORE (PAKISTAN)

ٹیلیفون نمبر ۶۷۵۳۵

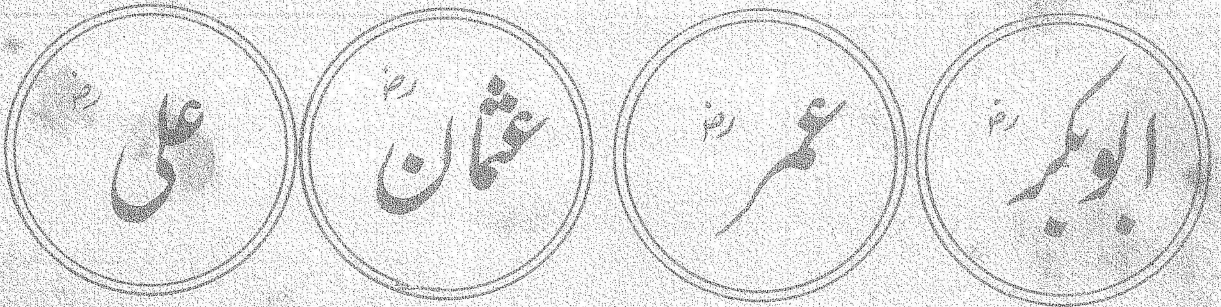
منظور شدہ محکمۂ تعلیم (۱) لاہور ریجن بذریعہ چٹھی نمبری G/۲۱/۱۹۳۳ مورخہ ۳ مئی ۱۹۵۶ء (۲) پشاور ریجن بذریعہ چٹھی نمبری T.B.C-۲۳۶/۲۳۸۱ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۵۶ء

(۳) کوئٹہ ریجن بذریعہ چٹھی نمبری ۲۹/۹/۲۰۷۹۶-D.D.9 مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۶۴ء (۴) راولپنڈی ریجن بذریعہ میمو نمبر G.M/۳۰-۱۵۲۱۰ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۶۷ء

خدام الدین کی تاریخی پیش کش

آسمانِ نبوت کے چار درخشاں ستارے

خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم



کی

سیرت و سوانح پر خدام الدین سالِ رواں میں چار عظیم الشان نمبر شائع کرے گا (ان شاء اللہ)

یہ نمبر تین تین ماہ کے وقفہ کے ساتھ شائع کئے جائیں گے

سب سے پہلے صدیق اکبرؓ نمبر ربیع الاول کے آخری ہفتہ میں منظر عام پر آئے گا۔

(مضمون نگار حضرات ۱۵ صفر المظفر تک اپنے مضامین بھیج دیں)

عبید اللہ انور پرنٹر پبلشر نے باہتمام ... پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر شیرانوالہ گیٹ لاہور سے شائع کیا۔